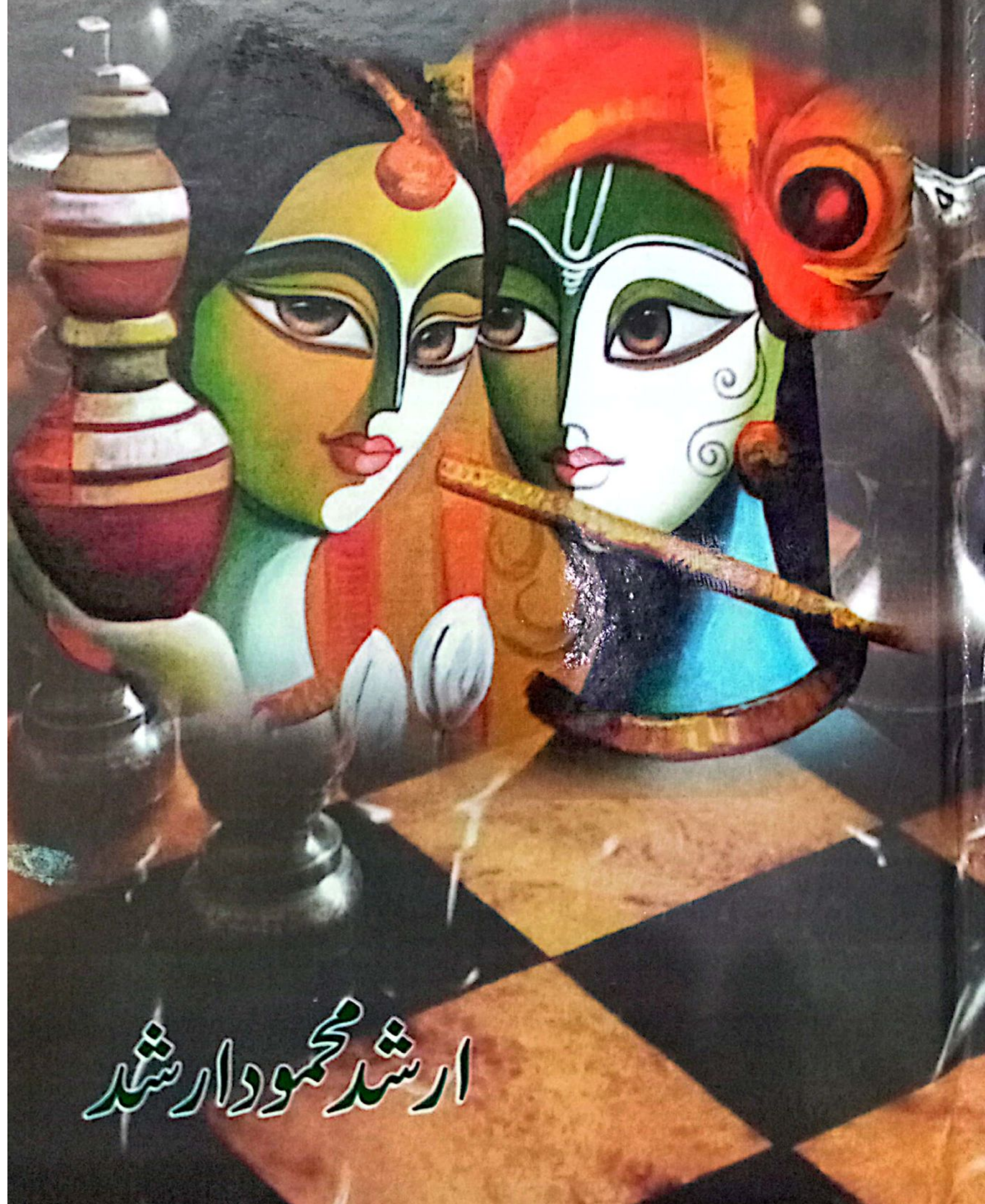
بساطِ زیست



ارشد محمود ارشد

بساطِ زیست

ارشد محمود ارشدؔ

ضابطہ



تزئین و آرائش: ملک عرفان خانی، ناظم اعلیٰ حرف اکادمی

ISBN: 978-969-8644-68-0

نام کتاب	:	بساطِ زیست
شاعر	:	ارشد محمود ارشدؔ
پبلشرز	:	حرف اکادمی پاکستان
پرنٹرز	:	شریف پرنٹنگ پریس، راولپنڈی
سرورق	:	سید شبیہ الحسن
اشاعت اول	:	2017ء
قیمت	:	300روپے
رابطہ	:	0300-6008622
		0336-5262149

پبلشرز : حرف اکادمی راولپنڈی

ایچ-9، اسٹریٹ 6، ہل ویو لین، اڈیالہ روڈ، راولپنڈی

0336-5262149

email; col.syedmaqboolhussaln@yahoo.com

انتساب

بے لوث

چاہتوں کے

امین

لوگوں

کے نام

ارشد محمود ارشدؔ کی دیگر کتب

عجب سی بے قراری ہے	شاعری	2007ء
کبھی میں یاد آؤں تو......	شاعری	2009ء
شام کی دہلیز پر	شاعری	2014ء
محبت بانٹ لیتے ہیں	مرتبہ	2010ء
نبی کا قصیدہ	مرتبہ	2010ء
تمہاری یاد کا موسم	مرتبہ	2011ء
کوئی تعبیر دو مجھ کو	مرتبہ	2011ء

فہرست

غزلیات

نظمیں

ادھورے پن کا ادراک

بعض روحیں، کسی چیز یا بات کا کھوج، تلاش اور جستجو لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ شاید انہیں ہمیشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کھویا ہوا ہے جو انہیں ہمیشہ ادھورا رکھے گا...... اور اپنی تکمیل کا شدید اضطراب انہیں اور ان کی سوچ کو کبھی چین نہیں لینے دیتا...... سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

ایسے لوگ کائنات میں آنکھیں کھولتے ہی اپنی کھوج کی ابتدا کر دیتے ہیں۔ آپ نے یقیناً ان بچوں کو دیکھا ہوگا جو کھیلنے کی بجائے کسی کونے میں بیٹھ کر ریت پر لکیریں کھینچتے رہتے ہیں ...... یا خلاؤں میں نگاہیں جمائے اپنی ہی ذات کے سفر پر نکل جاتے ہیں...... ایک ایسے راستے پر جس کی اپنی پہچان بھی نہیں ہوتی ...... وہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہیں ...... کیوں ہیں ...... اور کیا کر رہے ہیں...... لیکن وہ اپنے ہی اندر بیٹھے خود کو غور سے دیکھ رہے ہوتے ہیں......

آپ نے وہ بچے بھی ضرور دیکھے ہوں گے جو کھلے آسمان تلے لیٹ کر بادلوں کی تصویریں ترتیب دینے لگتے ہیں۔ "یہ لڑکی ہے' بال کھولے بیٹھی ہے' مجھے دیکھ رہی ہے"، "وہ میں ہوں...... اُڑ رہا ہوں"، "وہ کوئی بابا ہے سب کے درمیان میں کھڑا ہے" "وہ کوئی ہے جو دیوار بنا رہا ہے"، "اور...... وہ پرندہ ہے' کہیں جیسے بھیگا ہوا بیٹھا ہے"۔

ایسی ہی بہت سی کہانیاں بناتے بناتے وہ بے خبر سو جاتا ہے مگر اگلی صبح اسی بے چینی اور اضطراب کے ساتھ اُٹھ بیٹھتا ہے۔ پھر وہی ریت پر لکیریں' بادلوں کی تصویریں' بھیگا ہوا پرندہ...... ذات کا خوف زدہ کر دینے والا سفر...... وہ چاند کو دیر تک دیکھتا اور اس کی روشنی کو اپنی آنکھوں میں بھرنا چاہتا ہے۔ وہ تیز بارش میں بھیگتا اور پھسل کر گر جاتا ہے' پھر بھیگتا ہے' پھر گرتا ہے۔ منع کرنے کے باوجود بھی باز نہیں آتا' وہ بچہ ادھورے مناظر میں پلتا ہے' ادھورے پن کو سینے سے لگائے آگے

بڑھتا ہے' پھر ایک وقت آتا ہے جب اسے ''ادھورے پن'' کا ادراک ہو جاتا ہے...... مگر سبب دکھائی نہیں دیتا...... بھائی نہیں دیتا...... تب کبھی وہ کسی کینوس پر لکیریں کھینچ کر ان کے رنگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلا کر اپنے اندر کی تشنگی کو لکیروں اور رنگوں میں تلاش کرتا ہے یا پھر اس تشنگی کو ان کے سپرد کر دیتا ہے۔

کبھی وہ شعر کہہ کر اپنی ذات کے پرت لوگوں کے سامنے رکھتا چلا جاتا ہے' مگر اصل میں وہ یہ سارے پرت اپنے ہی سامنے رکھ کر وہ حصہ تلاشنے کی کوشش میں ہوتا ہے جو کہیں کھو گیا ہے۔

کچھ کھو جانا...... صرف اس کا خیال یا واہمہ نہیں ہوتا...... اس کی جستجو یہ ثابت کرتی ہے کہ کہیں کچھ ہے...... جو ملا تو وہ مکمل ہو جائے گا......

تو...... نثر لکھنا' لکھتے چلے جانا...... شاعری کرنا...... کرتے چلے جانا' پینٹنگ کرنا اور کرتے چلے جانا...... یہ سب وہی ہیں جو خود کو کھوجتے نکلے ہیں...... کون جانے کوئی مکمل ہوتا بھی ہے کہ نہیں...... لیکن یہی تو زندگی ہے...... پیدا ہونا' کھانا' پینا اور مر جانا...... انسان کی زندگی ہو ہی نہیں سکتی تو...... ارشد محمود ارشدؔ...... اسی قافلے کا فرد ہے......

خدا کہتا ہے خود کو کھوجنے کی کوشش کرو...... مانگنے کا سلیقہ پیدا کرو' میں تمہیں سب کچھ دوں گا' سو...... یہی اُمید ہے جو کسی باریک روشن لکیر کی طرح اس اندھیری دنیا میں کچھ لوگوں کو راستہ دکھاتی ہے۔ اور یہ لوگ...... اسی روشن لکیر کو تھامے آگے...... اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی روشن' باریک لکیر کا ایک سرا ارشد محمود ارشدؔ کے ہاتھوں میں بھی ہے۔ لیجیے میں ثابت کرتی ہوں کہ میں نے ٹھیک کہا۔

جدھر نگاہ کروں ریت ہے یا گرد و غبار
کہ سنگِ میل بھی صحرا کے راستوں میں نہیں

بس...... مجھے ارشد محمود ارشدؔ سے ایک شکایت ہے کہ ان کی تحریروں میں کہیں بے

ساختہ اور بہت بکھری ہوئی مایوسی دکھائی دیتی ہے۔ اتنی بکھری ہوئی کہ سمیٹنے میں ارشد کو بہت مشکل ہوگی...... جیسے......

بس اب تو شوق ہی اُڑنے کا رہ گیا ارشدؔ
ذرا سی جان بھی ٹوٹے ہوئے پروں میں نہیں

یا جیسے......

رفتہ رفتہ سب رگوں میں سنسناہٹ آ گئی
نفرتوں کے زہر کا ایسا اثر ہونے لگا

البتہ...... مندرجہ ذیل شعر پڑھ کر اچھا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے ارشد کے اندر وہ کھوجی بچہ آج بھی پوری آب وتاب سے موجود ہے جو اسے چین نہیں لینے دے گا اور...... وہ شعر ہے۔

اک دن اسی مقام پر آئیں گے وہ ضرور
ارشدؔ نے جانے والوں کو روکا نہیں کبھی

یہ یقین، یہ بھرپور اُمید اور یہ بے نیازی اور خود اعتمادی، تکمیل کی طرف پہلا قدم ہے اور ایسی ہی بہت سی اُمیدیں ارشد محمود ارشدؔ کی شاعری میں موجود ہیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میں کسی بے سمت، اُلجھے ہوئے اور کنفیوزڈ شخص کو نہیں پڑھ رہی، بلکہ ایک ایسے شخص کو پڑھ رہی ہوں جو نہ صرف پُر اُمید ہے بلکہ اپنے قاری کو اُمید کی "چنگاریاں" ہی سہی...... مگر بانٹ تو رہا ہے۔

سیما غزل

کراچی



درختوں اور پرندوں سے ہمکلام شاعر

ادبی دنیا میں ہوش سنبھالنے کے بعد جو پہلی آواز میرے کان میں اُتری وہ دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے ناموں کی تھی۔اس وقت تو خیر میں نہیں سمجھ سکا کہ آخر ان دونوں شہروں کو دبستان کیوں کہا گیا مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد پھر کھلا کہ اس وقت ادبی منظرنامے پر دو بڑے ادیب اور شاعر اپنے اپنے ارادت مندوں کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ان میں ایک نام جناب احمد ندیم قاسمی اور دوسرا نام ڈاکٹر وزیر آغا کا تھا۔کمال کی بات یہ ہے کہ ان دونوں بڑوں کا تعلق سرگودھا کی سرزمین سے تھا۔جناب احمد ندیم قاسمی بعدازاں ہجرت کر کے لاہور تشریف لے گئے جب کہ وزیر آغا سرگودھا میں ہی قیام پذیر رہے۔ان دونوں کی ادبی چپقلش نے دو ادبی گروہوں کو جنم دیا۔قطع نظر اس کے کہ ان دونوں ادبی گروہوں کی مخاصمت ادب کے لیے کتنی سودمند یا نقصان دہ ثابت ہوئی مگر اس کے نتیجے میں دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے نام سے وہ مکتبہ فکر پروان چڑھے جنھوں نے ایک عرصہ تک ادبی منظرنامے پر حکمرانی کی۔ملک اور بیرون ملک متحرک ادیبوں کی اکثریت کسی ایک دھڑے کے ساتھ منسلک ہونے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتی تھی۔اگرچہ دونوں بزرگان ادب کے رخصت ہونے کے بعد یہ گروہ ٹوٹ پھوٹ گئے لیکن اس

کے نتیجے میں جو ادبی تحرک پیدا ہوا اس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر بڑے ادبی مراکز سے الگ تھلگ سرگودھا جیسا شہر اپنی علیحدہ شناخت کے ساتھ نمایاں ہوا۔ آج بھی سرگودھا کی ادبی سرگرمیاں اس کی گواہی دے رہی ہیں کہ وہاں ایک تسلسل کے ساتھ سنجیدہ تخلیقی کام ہو رہا ہے۔

نثر اور شاعری ہر دو میدان میں یہاں کے ادیب اور شاعر بھرپور طریقے سے سرگرم عمل ہیں۔ انھی شاعروں میں ایک معتبر نام ارشد محمود ارشدؔ کا ہے جو ۲۰۰۰ء کی دھائی میں ادبی اُفق پر طلوع ہونے والے ان ستاروں سے تعلق رکھتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری کی چمک دمک سے اہلِ علم ادب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور میں سمجھتا ہوں ادبی دنیا میں صرف شعر کی بنیاد پر دوسروں کی توجہ حاصل کر لینا وہ کامیابی ہے جو شعراء کے ہجوم میں کم کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے اور وہ کم کم خوش نصیب وہی ہوتے ہیں جن کا مرکز و محور ان کا تخلیقی کام ہوتا ہے۔ وہ صلے اور ستائش کی تمنا کیے بغیر اس میں لگن کے ساتھ جُٹے رہتے ہیں۔ انہیں نہ تو کسی کے مشہور ہونے سے کوئی غرض ہوتی ہے اور نہ ہی شاعری ان کے لیے دنیا کمانے کا ذریعہ وہ تو صرف شعر کہتے ہیں مست رہتے ہیں۔

میں اپنے بعد میں آنے والے اچھے شعراء کی شاعری سے کبھی غافل نہیں رہا۔ ارشد محمود ارشدؔ بھی دیگر عمدہ شاعروں کی طرح مسلسل میرے مطالعے میں رہا۔ ادبی جرائد اور سوشل میڈیا جہاں بھی مجھے ان کی غزل پڑھنے کو ملی مرے لیے سرشاری کا باعث بنی یقیناً اس کا کوئی دعویٰ نہیں کہ وہ ایک عظیم شاعر ہے۔ لیکن ایسا بھی ہرگز نہیں ہے کہ اس کی شاعری کو نظر انداز کیا جا سکے۔ جب ہم خود ساختہ عظمت کے ڈر سے نکل کر شاعری کی تفہیم کا فریضہ انجام دیتے ہیں تو ایک خوشگوار حیرت ہماری رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً آنے والے غزل کے عمدہ شاعروں نے غزل کو اتنا امیر کیا ہے کہ غزل کی موت کا اعلان کرنے والے خود اپنی موت مر گئے ہیں۔

ارشد محمود ارشدؔ نے اپنی غزل کا خمیر عہد حاضر کی صورت حال اور اپنے اندرون کی دنیا

سے جنم لینے والی ایسی کیفیات سے اٹھایا ہے جو ہر پڑھنے والے کو اپنی محسوس ہوتی ہیں۔ عمدہ شاعری کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ شاعر اور قاری کے مابین فاصلوں کو ختم کر دیتی ہے اور جب یہ فاصلے ختم ہو جاتے ہیں تو پھر شعر کا قاری شاعر کی دنیا کا حصہ بن جاتا ہے۔ مرے خیال میں یہی وہ بنیادی بات ہے جو کسی شاعر کے کلام کو قبول عام کا درجہ دیتی ہے اور یہ سارے کا سارا عمل شعوری سطح پر شاید اس لیے بھی ممکن نہیں کہ جینوئن شاعر سب سے پہلے اپنے اور اپنی ترجیحات کا تابع ہوتا ہے۔ وہ صرف اور صرف انہی معاملات یا واردات کو اپنی شاعری میں اتارتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے اور جو شاعر ایسا کرنے پر قادر نہیں وہ محض مصرعے تو وزن میں کر سکتا ہے لیکن ان میں وہ شعری روح نہیں پھونک سکتا جو کسی شعر کو زندگی بخش سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے ہمارے ہاں مردہ شاعری کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں اور جنہیں وقت وقتاً فوقتاً سپردخاک کرتا رہتا ہے۔

ارشد محمود ارشؔد کے کلام میں زندگی اس لیے سانس لیتی ہے کہ اس نے اپنے سچ کو اس میں سمویا ہے۔ اس کے اپنے دکھ سکھ، محبتیں نفرتیں اور اپنا نظریہ زندگی اس کی شاعری میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنی شاعری کا خام مواد اسی مٹی سے اٹھایا ہوا ہے جہاں اس کے پاؤں جمے ہوئے ہیں اور یہ مٹی اس کے اپنے شہر سرگودھا کے مضافات کی ہے جہاں آج بھی درختوں اور پرندوں کی حکومت ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کی شاعری میں اس طرح نمایاں ہوا ہے۔

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہم کلام ہوا

اس لیے سر پہ اٹھایا ہے یہ غم کا سورج
دھوپ پڑتی ہے تو پیڑوں پہ ثمر آتا ہے



کٹ کے جب بھی درخت گرتا ہے
پھڑپھڑاتے ہیں تب پرندے بھی

پھول پرندوں اور درختوں سے محبت کرنے والا شخص ایسے گداز دل کا مالک ہوتا ہے۔ جسے دنیا بھر کے تمام انسانوں کے دکھ اپنے دکھ لگتے ہیں۔اسی احساس کی شدت اور حساسیت نے ارشد محمود ارشؔد کے کلام کو اس کی ذات سے نکال کر کائنات تک پھیلا دیا ہے۔

ارشد محمود ارشؔد کے شعری سسٹم میں نمایاں اور اہم بات اس کی جدید شعری حسیات سے آگاہی اور تازگی کا عنصر ہے اور یہی وہ عنصر ہے جو شاعری کے ظاہری لباس کو دیدہ زیب اور دلکش بناتا ہے اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون اگر بھونڈے طریقے سے بیان کیا گیا ہو تو وہ ہرگز اپنا تاثر نہیں چھوڑتا جبکہ بعض اوقات معمولی سی بات نئے رنگ ڈھنگ اور سلیقے سے بیان کی جائے تو وہ ایک ایسا لطفِ سخن پیدا کرتی ہے جو پڑھنے والے کے وجود میں اُتر کر اسے دائمی سرشاری عطا کرتی ہے۔ ارشد محمود ارشؔد نے بہت سے مقامات پر تازگی کے اس ہتھیار کو نہایت چابکدستی سے استعمال کیا ہے جس کی بدولت اس کا کلام بابرکت تاثیر سے آشنا ہوا ہے۔

چند شعر ملاحظہ کریں:

بدن کی بھربھری مٹی کو دھول کر بیٹھا
کسی کے واسطے میں راستہ بناتا ہوا

تو جہاں پھینک کر گیا تھا مجھے
دیکھ اب بھی وہیں پڑا ہوں میں

یہ کوئی اور طلب پانیوں میں لے آئی
مرا خیال کسی جل پری میں تھا ہی نہیں

کہانی انتہا تک آ گئی ہے
کہیں آیا نہیں کردار میرا
آؤ دو چار قدم چل کے ذرا دیکھتے ہیں
پھول بہتے ہوئے پانی میں کہاں سے آیا

ارشد محمود ارشدؔ کی شاعری کے ساتھ وابستگی والہانہ ہے اس کا شمار ان گنے چنے شعراء میں ہے جو اپنا لمحہ لمحہ شاعری میں گزارتے ہیں اور فی زمانہ ایسے شاعر کا دم شاید اس لیے بھی غنیمت ہے کہ اس بے مستی کے عہد میں کوئی تو ہے جو لوگوں کے دکھ درد نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ انہیں شعر کی زبان بھی دیتا ہے۔

مری دعا ہے کہ خداوند کریم ارشد محمود ارشدؔ کی شعری توفیقات میں مزید اضافہ کرے اور اس خوبصورت مجموعے کے بعد بھی اس کا شعری سفر بلندی کی طرف جاری رہے۔ آمین

قمر رضا شہزاد

☆☆☆



دم ساز

چناب اور جہلم کے درمیان کی زمینیں عجیب و غریب صلاحیتوں کی زمینیں ہیں کہ ان کے اندر کی آنچ میں گندم، کنوں اور محسوسات کی فصلیں ایک جیسی توانائی کے ساتھ اُگتی اور پھلتی پھولتی ہیں یہاں کی گندم میں خصوصی دمک ہوتی ہے، یہاں کے کینوں میں ایک البیلی چمک ہوتی ہے اور یہاں کے باسیوں میں محسوسات کی دُنیا انوکھی اور پرت در پرت جذبوں سے بُنی ہوئی ہوتی ہے احساس و جذبہ زمین کے مساموں میں سفر کرتا ہوا یہاں کے باسیوں کے مزاجوں میں منتقل ہوتا ہے۔ تو علوم و فنون کی کارگہیں چلتی ہیں، شعور و فکر کے دیے روشن ہوتے ہیں۔ جذبہ و احساس کے تار جھنجھناتے اور سروں میں ڈھلتے ہیں۔

ارشد محمود ارشدؔ بھی اسی دیس کا جھنجھنایا ہوا ساز ہے جو شعر و نغمہ میں ڈھلتا ہے تو بھلا لگتا ہے کہ اس کا تخلیقی سفر سماجی اور ثقافتی فنی سروں پر محیط ہے۔ ارشد کی شاعری میں اظہار و ابلاغ قدرتی ہے، فکر و خیال جن ارتقائی منازل سے گزرا ہے، وہ فطری ہیں رومانیت کے ساتھ منفرد و تخلیقی صلاحیت اس کے ہاں مالک کی دین ہے مگر ان کا مطالعاتی اور مشاہداتی تسلسل سراسر اپنا اور سراسر انفرادی ہے جو دلگداز بھی ہے اور دلفریب بھی ......فن پر گرفت کے ساتھ اس کا خوبصورت مترنم انداز مزہ دیتا ہے۔

اسے میں رازداں کرنے لگا تھا
لپٹ کے رو پڑی دیوار مجھ سے
زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے

ارشد محمود ارشد کے ہاں سلیقہ اظہار طرح دیتا اور کاروبار دنیا کی تپش اور سلگن میں ایک ٹھنڈی میٹھی شعری فضا قائم کرتا چلا جاتا ہے پھر اس شعری فضا میں ان کا سوچتا ہوا اظہار فکر، شعور انسانی پر اپنے اثرات مرتسم کرتا ہے۔ سلگتی ہوئی دھوپ چھاؤں میں اس مخصوص شعری فضا کی چھتری اپنی ذمہ داری نبھاتی اور ٹھنڈکیں فراہم کرتی چلی جاتی ہے۔

بوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دیوار اٹھانا ٹھیک نہیں

اُلجھ کر راستے میں سوچتا ہوں
کوئی دمساز ہونا چاہیے تھا

کوئی تو سانحہ گزرا ہے اس پرندے پر
کہ آدھی رات کو جو گھونسلے سے باہر ہے

ارشد محمود ارشد کے اشعار کے مضامین تفکر آمیز بھی ہیں اور بہجت آفرین بھی۔ ان کی غزلوں میں دل پر گزرنے والی کیفیات اپنے اظہار کے تسلسل میں کیف وکم کا خلوص کیش مجموعہ ہے۔ انھوں نے بجا طور پر غزل میں نوجوان شعرا کی نمائندگی کی ہے۔ اپنے پورے تہذیبی رچاؤ کے ساتھ ان کے پاس محبتوں کی کسک بھی ہے، جذبے کی آنچ بھی اور خیال کی پرواز بھی۔ خالصتاً انسانی رشتوں کے باہمی تعلق، محبت ومروت کے مناظر اور رنگ وآہنگ کی دنیا ان کی شعری فضا کو خوشبودار کرتی اور مشام جاں معطر کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کا تخلیقی وفور قابل ذکر اس لیے بھی ہے کہ یہ فکری رجحان معاشرتی خمیر سے توانائی حاصل کرتا ہے اور شعری فضا ترنم ریز ہو جاتی ہے

بساط ارادت

ان کی شعری دنیا کے معنی و مفاہیم مقامی تہذیبی زندگی سے متعین ہوتے ہیں۔

بینائی کا فیصلہ ہونے والا ہے
میں نے اک سورج سے آنکھ ملا لی ہے

یہ مٹی پاؤں مرے چھوڑتی نہیں ورنہ
فلک کا راستہ بھی سامنے پڑا ہوا ہے

ارشد کی پرواز اپنا ابتدائیہ ختم کر چکی ہے اور ابھی کھلی فضاؤں میں اسے دور تک جانا ہے مجھے یقین ہے کہ ان کا شعری سفر اپنی اڑانوں کی تکمیل پر دور دراز کے قصے اور داستانیں بھی اپنے ساتھ لائے گا اور داستان گوئی وہیں سے شروع ہوگی جو چناب اور جہلم کے عین وسط کی اس سرزمین کا ورثہ ہے۔ وہ اپنی تہذیب میں اپنا جہان معنی پیدا ہی نہیں کریں گے، اس کی ترسیل بھی کریں گے۔

دستِ قضا بڑھا ہے مری سمت الوداع
اے اعتکافِ عشق عبادت تمام شد

وہ اپنے شعری سفر میں ظفر مند ہیں اور میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت انھیں مزید کامرانیاں عطا فرمائے۔ آمین

ارشد ملک

اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلی کیشنز یونیورسٹی آف سرگودھا



ارشد محمود ارشدؔ کی شعری کائنات

جواں فکر شاعر ارشد محمود ارشدؔ سے میرا تعلق کئی برسوں پر محیط ہے یہ ۲۰۰۵ء کی بات ہے جب میں ملتان سے شاہینوں کے شہر سرگودھا میں اقامت گزین ہوا تو ایک خوبرو اور خوش گفتار نوجوان سے بزم فکر و خیال کی ادبی محفل میں ملاقات ہوئی۔ پتہ نہیں ارشد میں وہ کون سی بات تھی کہ وہ مجھے اپنا اپنا سا لگا۔ پھر مزید ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا تو اس کی شخصیت کے اور بہت سے خوبصورت پہلو بھی سامنے آئے، یہ بات طے ہے کہ ارشد محمود ارشدؔ ایک جینوئن شاعر اور محبت کرنے والا انسان ہے۔ میرے نزدیک انسانی محبت کا پہلو اس کا سب سے نمایاں وصف ہے کیونکہ محبت اور اخلاص کی ہر زمانے میں ضرورت رہی ہے۔ محبتوں کے چراغوں سے ہی نفرتوں کے اندھیروں کو مٹایا جا سکتا ہے۔ ارشد محمود ارشدؔ کی شاعری کا بنیادی وصف محبت اور سماجی شعور ہے وہ اپنے شعری منشور کا اعلامیہ اس طرح تحریر کرتا ہے۔

چراغوں کو جلانے کی لگن میں
ہواؤں سے عداوت بڑھ گئی ہے

مجھے اک جل پری نے چھو لیا تھا
مری سانسوں کی حدت بڑھ گئی ہے

ہر اک منظر میں تجھ کو کھوجتا ہوں
بچھڑنے سے محبت بڑھ گئی ہے

ارشد محمود ارشدؔ کا اولین شعری مجموعہ ''عجب سی بے قراری ہے'' ۲۰۰۷ء میں ادب رنگ پبلی کیشنز ملتان کے زیر اہتمام ملتان سے شائع ہوا۔ جبکہ ارشد کا دوسرا مجموعہ کلام ''کبھی میں یاد آؤں تو'' ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آیا جبکہ ۲۰۱۴ء میں تیسرا شعری مجموعہ ''شام کی دہلیز پر'' اشاعت پذیر ہوا۔ ان تخلیقی شعری مجموعوں کے علاوہ ارشد محمود ارشدؔ نے چار شعری انتخاب بھی مرتب کیے جن کے بالترتیب نام ''محبت بانٹ لیتے ہیں''، ''نبی کا قصیدہ''، ''تمہاری یاد کا موسم''، ''کوئی تعبیر دو مجھ کو'' ہیں۔ ارشد محمود ارشدؔ کا نیا شعری مجموعہ ''بساطِ زیست'' ہے۔ ارشد محمود ارشدؔ کی شاعری کی تفہیم کے لیے ان کے شعری سفر کو بتدریج دیکھنا پڑے گا۔ میں نے ارشد کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شاعری کو تفصیل سے پڑھا ہے، بے شمار ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔ اس کا کلام بھی محافل میں سننے کا بارہا موقع ملا۔ تاہم جو بات سب سے زیادہ مضبوط ہو کر سامنے آئی وہ اس کی انسانوں سے محبت اور سماجی و معاشرتی شعور ہے اور یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ سماجی شعور کا سب سے زیادہ ادراک وہی شخص رکھتا ہے جو اپنے سماج سے محبت کرتا ہے۔ ارشد نے نہ صرف لوگوں سے محبت کی ہے بلکہ سماجی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز بھی بلند کی ہے۔ ارشد محمود ارشدؔ اپنے پورے یقین کے ساتھ شعر و ادب سے منسلک رہنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے وجدان میں ایسے احساسات اور جذبات کو جگہ دیتا ہے جن کا تعلق عصری تناظر اور ہم عصر معاشرے سے ہوتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے۔

غم اُٹھا کے بھی مسکراتا ہوں
کون سی خاک سے بنا ہوں میں
تو جہاں پھینک کر گیا تھا مجھے
دیکھ اب بھی وہیں پڑا ہوں میں
اپنی میت اٹھائے پھرتا ہوں
ایک مدت سے مر چکا ہوں میں

ارشد محمود ارشؔد کے مذکورہ بالا اشعار جس Sensitivity کا پتہ دیتے ہیں وہ اس کے ایک حساس فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہ بات مسلمہ ہے کہ ایک حساس فن کار ہی اپنے گرد و پیش بسنے والے لوگوں سے محبت کر سکتا ہے وہ محبت محض رومانوی جذبات پر مبنی نہیں ہو گی بلکہ اس میں انسانی اقدار کی پاسداری کا آدرش بھی موجود ہو گا۔

زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے

اگر تو قتل میں شامل نہیں تھا
تو چھینٹے کس لیے ہیں آستیں پر

زمانہ خوف کھاتا کس لیے ہے
فقط محراب ہے میری جبیں پر

ارشد محمود ارشؔد کی شاعری متنوع افکار کی حامل ہے۔ وہ معروف ادبی مراکز سے دُور رہ کر بھی اپنی شعری شناخت کو اپنا حوالہ بنانا چاہتا ہے ہر چند کہ سرگودھا ایک معروف دبستان ہے تاہم یہاں وہ ابلاغی سہولتیں میسر نہیں ہیں جن کا سہارا لے کر بہت سے بالشتیے قد آور بن چکے ہیں تاہم وہ یہ نہیں جانتے کہ میڈیا کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے، کسی فنکار کی بقاء کا انحصار اس کی تخلیقات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ارشد محمود ارشؔد بھی اس جتن میں ہے کہ اس کے لفظ معتبر ہو جائیں، اس مقصد کے حصول کے لیے وہ پوری دیانت داری سے اپنا شعری سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ارشد کا تازہ مجموعہ کلام ''بساطِ زیست'' اس کا چوتھا پڑاؤ ہے، جسے پڑھ کر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ اپنی منزل کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ معاصر شعری ادب میں ارشد محمود ارشؔد ان نوجوانوں

کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ان کا یہ اعتماد شعری ایقان کی صورت میں ان کے اشعار سے مترشح ہو رہا ہے۔

میں اپنے آپ سے کر سکتا ہوں دغا بازی
اور ایک وصف ہے مجھ میں وفا شعار بھی ہوں

خواہشیں شور مچاتی ہیں مرے دل میں کئی
ایک بس تیری طلب سب سے جدا گونجتی ہے

شب کے پہلو میں جب تو سو جائے
ایک دنیا ہے جاگتی سورج

ذرا سی دور لٹیروں کی ایک بستی ہے
گزر چکا ہوں میں اس راستے سے پہلے بھی

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ایک ساتھ نظر آتا ہے وہ معاشرتی تضادات کے ساتھ ساتھ داخلی تصادم کا بیان کرنے میں بھی مہارت رکھتا ہے۔

کیا عجب کہ ارشد محمود ارشد کی شعری اور فنی ریاضت اس کے خوابوں کو جلد تجسیم کر دے اور وہ ایسا منظر نامہ دیکھنے میں کامیاب ہو جائے جس کے لیے وہ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

میں ارشد محمود ارشد کے نئے مجموعہ کلام "بساطِ زیست" کا کھلے بازوؤں سے استقبال کرتا ہوں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ڈاکٹر شفیق آصف

صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، میانوالی کیمپس



بساطِ زیست اور قصرِ ذات

بساطِ زیست ارشد محمود ارشدؔ کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ تخلیقی اور شعری حسن کی حامل غزلیات اور پرتاثیر نظموں کی لفظیات کی بناء پر انہیں دبستانِ سرگودھا میں ایک منفرد مقام مل چکا ہے۔ ناقدینِ فن کی پزیرائی انہیں تسلسل سے اپنے احساسات وجذبات کو بیان کرنے کا حوصلہ عطا کر رہی ہے۔ زمین کے سفر میں اگر کوئی شے آسمانی ہے تو وہ محبت ہے۔ اور ارشد محمود ارشدؔ نے بساطِ دل بھی محبت کی زمین پر بچھائی ہے۔ ہر شعر میں ایجاز واختصار کو نمایاں کر کے ایک سچے تخلیق کار کی طرح لفظوں کو صدا دی ہے۔ ذات کی نفی کرتے ہوئے شبِ غم میں امید کے دیے جلائے ہیں۔ ذاتی احساسات اور تجربات اور مشاہدے کے ہنر کو کمال بخشتے ہوئے بساطِ زیست پہ شعری حسن کے سہرے سجائے ہیں۔ وہ ان شعری محاسن سے بھی واقف ہیں جس سے غزل کا روپ سنورتا ہے۔ وہ ان جذبات کی حرمت اور منزلت سے بھی بہرہ ور ہیں جس سے نظموں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

ارشد محمود ارشدؔ نے چہروں کی دنیا میں پزیرائی کی محفل سجائی ہے اور ملک کے کونے کونے سے شعراء کی پزیرائی اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ تخلیقی سچائی اور اس کی پزیرائی کی خوبصورت کیفیت کو اولین سرمایہ قرار دیتے ہوئے فکر انگیز علامتوں میں اپنی زیست کی شعری خوش رنگی بڑھا رہے ہیں۔ اور ان فکر انگیز علامتوں میں ژولیدگی نہیں ہے تصنع اور کوئی شعوری الجھن بھی نمایاں نہیں۔ اپنے تاثر اور اپنے اعتقاد پر اطمینان کا وقار کچھ اس طرح نمایاں ہے

ایسے بھی آزار اٹھانا ٹھیک نہیں
احسانوں کا بار اٹھانا ٹھیک نہیں
بوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دیوار اٹھانا ٹھیک نہیں

بساطِ زیست

ہجر و وصال کے حسین موسموں، جگنو بن کر آنکھ میں اترنے والے خوابوں اور شبِ غم کے اندھیروں سے نکل کر اس شعری مجموعے میں ارشد محمود ارشدؔ سماجی مسائل کو بڑی حساسیت سے بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زیست کا شعور اور فلسفیانہ شعور لہجے اور فکر کو مؤثر بنا رہا ہے۔۔۔ سماجی مسائل مضامینِ غزل میں اس طرح باندھے ہیں کہ غزل کا سوز اور اسلوب بیان بھی برقرار رہا ہے:

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا

وہ جو فٹ پاتھ پر اوندھا پڑا ہے
کبھی اس شخص کا بھی گھر رہا تھا

اک بھیڑیا تھا دوستی کی کھال میں چھپا
اس نے مرے وجود کو کھایا تھا اور بس

زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے

پھر اس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اجرت
ہمارے خون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے

ایک عمدہ تخلیق کار پزیرائی پہ یقین رکھتا ہے اس لئے پزیرائی چاہتا بھی ہے اور چند اشعار ہوں یا چند غزلیں وہ ہر مستند شاعر کے قلم سے ضرور سرزد ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے درد سوز و گداز اور حسن و جمال سے آراستہ پیراستہ ان اشعار سے قاری کو باخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ارشد محمود ارشدؔ طبعاً غزل کے شاعر ہیں:

چشمِ نمناک میں اُگی بارش
پھر بڑی دیر تک ہوئی بارش

دل سمندر سے بن گیا صحرا
تو نے بخشی نہ پیار کی بارش
کشتِ دل پہ تمہاری یادوں کی
روز ہوتی ہے ریشمی بارش
دلِ مضطر کے سب کھلونے ہیں
تتلیاں پھول جل پری بارش
شام ڈھلنے پہ آ گئی ارشدؔ
اور اب تک نہیں تھمی بارش

وقت کی آواز میں سکوتِ جاوداں ہر لمحۂ گزشتہ کا احساس دلاتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور شاعری کے فنِ لطیف کو ذہنی سفر توانا رکھتا ہے ایک شاعر جو خود پسند نہ ہو وہ اپنی ذات کا ادراک بخوبی رکھتا ہے اور فلسفۂ شاعری کو بس یہی ادراک چاہیے۔۔۔۔اس عہدِ پارسائی میں شرمساری کا احساس کسی کسی کو ہے:

یہ مرا دین یہ مذہب غرور ہے ارشدؔ
عمل یہ دیکھ کے اپنے میں شرمسار بھی ہوں
لبادہ اوڑھ کے رکھتا ہوں میں روایت کا
خیالِ دشت کا اِک شتر بے مہار بھی ہوں

بساطِ زیست و فلسفۂ زیست کو سمجھنے والے جانتے ہیں کہ ارسطو کے نظریہ کتھارسس نے کئی تنقیدی زاویوں کو جنم دیا اور جدید نفسیات میں کتھارسس نے ارتفاع کی شکل اپنائی۔عصرِ حاضر میں ارتفاع کا عمل شاعری کے جذباتی اثر میں شامل ہوتا گیا اور شاعروں نے ایمان عقائد نسل رنگ لسانیات کی بنیاد پر ہونے والے ہنگاموں، انتشار کو صدمے کی طرح محسوس کیا اور جذبات کا اظہار

کیا۔ باہمی نفرتوں اور خیالی جنتوں کو پروان چڑھانے والوں کے لیے ارشد محمود ارشدؔ کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں:

وظیفہ تجھ کو بتاتا ہوں ایک چاہت کا
جو قصرِ ذات سے نفرت کا شر نکالتا ہے
نجانے کونسی جنت کی جستجو ہے تجھے
کہ جس کے واسطے جینا مرا حرام ہوا

نظموں میں بھی ارشد محمود ارشدؔ کا طرزِ بیاں صاف اور فکر بلند ہے:

ابنِ آدم

کوئی جب پوچھتا ہے یہ
شیعہ ہو تم یا سنی ہو
وہابی ہو کہ دیوبندی
بتاؤ کونسے فرقے سے نسبت ہے
نجانے کیوں مجھے اِک پل
سجھائی کچھ نہیں دیتا
میں گہری سوچ میں تب ڈوب جاتا ہوں
مرے اندر سے اِک آواز آتی ہے
سُنا ہے تم نے بچپن سے
کہ تم تو ابن آدم ہو
تو پھر سچ سچ بتاؤ نا
مسلمانوں کے فرقے کیا
یہ ہندو، سکھ، نصاریٰ، پارسی تک بھی
جہاں میں جتنے انساں ہیں

مرے بابا کے بیٹے ہیں
یہ مانا شکل و صورت میں
ذرا سے مختلف ہوں گے
رگوں میں دوڑتا ہے جو
لہو تو ایک جیسا ہے
سبھی اولادِ آدم سے
کہ جس میں آدمیت ہو
مری تو اس سے نسبت ہے
اُسی سے خون کا رشتہ
یہی سچ ہے
کہ جب میں ابنِ آدم ہوں
مرا مذہب وہی ہے جو
مرے بابا کا مذہب تھا

یہ نظم بلاشبہ آج کے دور کے شرانگیز جذبات کے سامنے ایک ڈھال ہے اس نمائندۂ اعلیٰ جذبات نظم کے لیے خصوصی داد و تحسین...... فلسفیانہ فکر اور عصرِ حاضر کے دکھ قصرِ ذات میں رہنے کا فن اور عرفانِ ذات کا حصول محبت کا عکس اور اس کی حقیقت تک رسائی کی جستجو کے حاصل اس شعری مجموعے کو پڑھ کر بے ساختہ داد و تحسین کے ساتھ دُعا کا احساس بھی جاں گزیں ٹھہرتا ہے۔ میری دُعا ہے ارشد محمود ارشدؔ صاحب کمال شعراء کی صفِ اولین میں شامل ہو جن کے ہنر اور فن کی پزیرائی وسیع پیمانے پر کی جاتی ہے...... نہ صرف حال بلکہ مستقبل میں بھی ان کی پزیرائی اور طرزِ فکر کو باذوق لوگ اپنا اثاثہ سمجھتے ہیں۔

صائمہ نورین بخاری
ادبی آنگن ملتان

مجھے کچھ کہنا ہے

''عجب سی بے قراری ہے'' سے نکلتا ہوا......کبھی میں یاد آؤں تو......کی صدا لگاتا......
شام کی دہلیز پر......''بساطِ زیست'' بچھائے بیٹھا ہوں کہ سانسوں کی ہوت باقی ہے تو کھیل جاری ہے............ یہ شہرِ ادب بھی کسی حیرت کدے سے کم نہیں ...... یہاں گام گام پر مختلف رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں طنز کے تیروں سے لہولہان وجود......تو کہیں داد و تحسین کی پھول پتیوں سے مشامِ جاں تک معطر ہو جاتا ہے کہیں حوصلہ بڑھایا جاتا ہے کہیں راستہ روکا جاتا ہے، کہیں بے پناہ اپنائیت کا اظہار، کہیں انتہائی اجنبیت کا احساس۔

میں اس ریگزار کا تنہا مسافر نہیں مگر خود کو قافلے سے باہر محسوس کرتا ہوں لیکن میں آبلہ پا ہو کر بھی ہمت نہیں ہارتا کہ میری آبلہ پائی میرے حوصلے پست نہیں کرتی بلکہ ہمت بندھاتی ہے اسی لیے لڑکھڑاتے ہوئے بھی توازن بگڑنے نہیں دیتا۔ مجھے زیست کے اس تپتے صحرا میں چلنا ہے، آگے بڑھنا ہے۔ سفر دشوار سہی منزل دُور سہی مگر امید کی رمق باقی ہے۔ شعر میری زندگی ہے شاعری میرا جنون......اپنی بے ربط سوچوں کو تجسیم کرنا میرا مشغلہ نہیں مجبوری ہے کہ جب سوچ کا خام مال غبار بن کر اٹھتا ہے تو دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

اس لیے شعر کہنے لگتا ہوں
بڑھ نہ جائے غبار سینے میں

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرے قصرِ سخن کی اساس محبت پر استوار ہے میرا پہلا ادبی پڑاؤ مکمل طور پر اس وارداتِ قلبی پر خیمہ زن ہے لیکن اس ادبی سفر کے ہر سنگِ میل پر میں نے جو شعری نقوش اُبھارے ہیں ان میں محبت کی چاشنی بھی ہے اور رویوں کی تلخی بھی ...... سماجی

ناہمواریوں کا کرب بھی ہے اور معاشرتی روایات و دقیانوسی اقدار سے بے زاری بھی......

دنیا میرے نزدیک ایک تماشائے حیرت ہے میں اسے اپنی نظر سے دیکھنے کا خواہاں ہوں اور اسے اپنے زاویے سے سوچنے کا تمنائی...... میں اپنی منہ زور سوچوں کو لفظوں کی زنجیروں میں جکڑنے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں مگر یہ ضروری نہیں کہ میں ہر بار ان پر حاوی آ سکوں کبھی کبھی وہ لفظوں کی ڈور میں ادبی فن پارے میں ڈھل جاتی ہیں اور کبھی بغاوت کر کے میری بے قراری میں مزید اضافے کا موجب بنتی ہیں۔ جب سے لفظوں سے کھیلنے کا ہنر آیا ہے یہ کھیل ایسے ہی جاری ہے اور یہ بساط تب تک بچھی رہے گی جب تک سانسوں کی ہوت باقی ہے۔

میں اپنے ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں کہ جن کا ساتھ اس گھٹن زدہ ماحول میں بھی تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ میں سپاس گزار ہوں محترمہ سیما غزل، قمر رضا شہزاد، ارشد ملک، ڈاکٹر شفیق آصف کا کہ انھوں نے میرے اس ادبی اثاثے پر اپنے قیمتی تاثرات کا اظہار کیا۔

میں مشکور ہوں جناب کرنل سید مقبول حسین (حرف اکادمی) اور ملک عرفان خانی کا کہ انہوں نے میری کتاب کی طباعت میں تعاون کیا۔

صحت و سلامتی کی دُعائیں آپ سب کے لیے۔

ارشد محمود ارشد



نعت رسول مقبولؐ

اِن اندھیروں کو پھر روشنی چاہیے
اِک نگاہِ کرم آپؐ کی چاہیے

جب تلک آپؐ کا نام لب پہ رہے
تب تلک بس مجھے زندگی چاہیے

نعت کہنے کی مجھ کو سعادت ملی
کچھ سخن کو مرے تازگی چاہیے

یا نبیؐ یا نبیؐ سُر نکلتے رہیں
میرے ہونٹوں کو وہ بانسری چاہیے

وہ جہاں پہلی آیت اُتاری گئی
جا کے غارِ حرا دیکھنی چاہیے

ذکر کرتا ہوں میں آپؐ کا اس لیے
قلب ارشدؔ کو بھی شانتی چاہیے



سلام

شعورِ ضبط میں سب آگہی حسینؑ کی ہے
چراغِ دین میں یہ روشنی حسینؑ کی ہے

شہید، شہد سے میٹھا ہوا ہے کچھ ایسے
اس ایک لفظ میں سب چاشنی حسینؑ کی ہے

انہیں کے نام پہ اس کو لٹا بھی سکتا ہوں
کہ میرے پاس مری زندگی حسینؑ کی ہے

کچھ اس لیے بھی مجھے گھر تو گھر نہیں لگتا
سمائی آنکھ میں جو بے گھری حسینؑ کی ہے

اسی کو ایک نہ اک دن مراد ملتی ہے
کہ جس کے پیشِ نظر رہبری حسینؑ کی ہے

متاعِ زیست لٹاتا نہیں کوئی ایسے
یہ صرف جوش نہیں دلبری حسینؑ کی ہے

پرانے لفظ ہیں لہجہ بھی لڑکھڑاتا ہوا
مرے سخن میں مگر تازگی حسینؑ کی ہے

یوں دو جہان کی دولت سمیٹ لی ارشدؔ
کہ میرے حصے اب چاکری حسینؑ کی ہے



سلام

پہلے سوچ کے دھارے ماتم کرتے ہیں
اور پھر ہم تصویر ترا غم کرتے ہیں

ان لوگوں کی بینائی بڑھ جاتی ہے
تیری یاد میں جو پلکیں نم کرتے ہیں

روتے ہیں کچھ لوگ غمِ شبیر میں یوں
درپردہ وہ دکھ اپنے کم کرتے ہیں

کرب و بلا میں سوچ ہمیں لے جاتی ہے
ریت کے ذروں میں خود کو ضم کرتے ہیں

جس جھنڈے کو حرمت بخشی غازی نے
آج بھی گھر گھر اونچا پرچم کرتے ہیں

ضبط کا بندھن ارشدؔ ٹوٹ بھی سکتا ہے
دکھلاوے کو گریہ کب ہم کرتے ہیں



O

مرتے ہوئے وجود کی حسرت تمام شد
سانسوں سے لپٹی آخری چاہت تمام شد

ساقی تمہارے مدھ بھرے ہونٹوں کا شکریہ
بادہ کشی کی ساری حلاوت تمام شد

ٹوٹی ہے آج سانس کی ڈوری تو یوں ہوا
ان دیکھی منزلوں کی مسافت تمام شد

بجھتے ہوئے چراغوں کی صورت ہوا ہوں میں
اک خوبرو وجود کی طاقت تمام شد

دستِ قضا بڑھا ہے مری سمت الوداع
اے اعتکافِ عشق عبادت تمام شد

اے بارگاہ حسن کوئی فیصلہ تو کر
اس نامراد عشق کی حجت تمام شد

ارشدؔ مجھے تو غیب سے آتی ہے اب صدا
ابنِ تراب اب تری مہلت تمام شد



زمیں کی کوکھ سے پہلے شجر نکالتا ہے
وہ اس کے بعد پرندوں کے پَر نکالتا ہے

شبِ سیاہ میں جگنو بھی اِک غنیمت ہے
ذرا سا حوصلہ اندر کا ڈر نکالتا ہے

کہ بوڑھے پیڑ کے تیور بدلنے لگتے ہیں
کہیں جو گھاس کا تنکا بھی سر نکالتا ہے

پھر اس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اُجرت
ہمارے خون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے

وظیفہ تجھ کو بتاتا ہوں ایک چاہت کا
جو قصرِ ذات سے نفرت کا شر نکالتا ہے

کہانی لکھتا ہے ایسے کہ اس کا ہر کردار
نکلنا کوئی نہ چاہے، مگر نکالتا ہے

میں ایسے شخص سے ارشدؔ گریز کیسے کروں
فصیلِ دل میں جو دستک سے در نکالتا ہے



گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہم کلام ہوا

بنانے والے نے سوچا یہ دل بناتے ہوئے
کہیں تو اپنے بھی رہنے کا انتظام ہوا

فلک سے یونہی تو ہم خاک پر نہیں آئے
ہمارے واسطے کیا کیا نہ اہتمام ہوا

نجانے کونسی جنت کی جستجو ہے تجھے
کہ جس کے واسطے جینا مرا حرام ہوا

بچا کے لایا تھا جنات سے میں شہزادی
اسی کے ساتھ کہانی کا اختتام ہوا

عجیب کیف میں ڈوبی تھیں انگلیاں ارشدؔ
کسی کا لمس مری عمر بھر کا جام ہوا

○

اس زندگی کی ہار سے دلگیر مت سمجھ
دُنیا کو میرے پاؤں کی زنجیر مت سمجھ

محشر میں کام آئیں گے اعمال ہی ترے
نام و نسب کو باعثِ توقیر مت سمجھ

میں بھی سخن شناس ہوں کچھ حق مجھے بھی دے
شہرِ ادب کو باپ کی جاگیر مت سمجھ

سینہ سپر رہے نہ جو صرصر کے سامنے
اس ٹمٹماتی لو کو تُو تنویر مت سمجھ

قرطاس پر پڑے ہوئے مردہ حروف ہیں
جس میں رمق نہیں اسے تحریر مت سمجھ

پانی اُبل رہا ہے یہ باطن کی آگ سے
آنسو ہمارے درد کی تشہیر مت سمجھ

کچھ سازشیں بھی کام دکھاتی ضروری ہیں
ارشد ہر ایک حادثہ تقدیر مت سمجھ



تلخ لہجہ ذرا ہوا مرے دوست
ورنہ دل کا نہیں برا مرے دوست

یار مجھ کو بھی سانس لینے دے
ہاتھ گردن سے اب ہٹا مرے دوست

تو کسی دھات سے بنا تو نہیں
زعم کرتا ہے خود پہ کیا مرے دوست

لٹنے والوں کی بات رہنے دے
میں نے پوچھا ہے راستہ مرے دوست

آ بھی سکتا ہے دسترس میں کبھی
تو نہیں ہے کوئی خدا مرے دوست

دن بدلتے نہیں ہیں رونے سے
حوصلہ! دیکھ، حوصلہ مرے دوست

تم نہ سمجھو تمہاری مرضی ہے
میں نے کہنا تھا کہہ دیا مرے دوست

عیب مجھ میں تو لاکھ ہیں ارشدؔ
میں کہاں تم سا پارسا مرے دوست



زرد آنکھوں میں کئی پھول کھلا سکتی ہے
وہ کسی روز مرے خواب میں آ سکتی ہے

غیر ممکن ہے مگر کر کے دکھا سکتی ہے
زندگی موت سے آنکھیں بھی ملا سکتی ہے

کھینچ لائی ہے طلب در پہ ترے آج مجھے
اک جھلک تو میرے کاسے میں گرا سکتی ہے

جگ کی وسعت کا بھرم بھی نہیں توڑا جاتا
ورنہ دنیا مری مٹھی میں سما سکتی ہے

دیکھ لہجے کو ذرا دھیما ہی رکھنا ارشدؔ
ورنہ وہ لڑکی بہت شور مچا سکتی ہے

○

حسیں آنکھوں کی بیعت ہو رہی تھی
روایت سے بغاوت ہو رہی تھی

کوئی پیکر صحیفے میں ڈھلا تھا
نگاہوں سے تلاوت ہو رہی تھی

کمالِ فن تھا جو تیشہ گری کا
اسی بُت کی عبادت ہو رہی تھی

تعلق ٹوٹنے پر آ گیا تھا
پس پردہ شرارت ہو رہی تھی

سرِ مژگاں ستارے جھومتے تھے
خوشی اس ڈھب سے رخصت ہو رہی تھی

مرے اندر کا مجنوں مر چکا تھا
اسے مجھ سے محبت ہو رہی تھی

ہوائیں چار سو رقصاں تھیں ارشدؔ
دیے کی غیر حالت ہو رہی تھی

O

ایک جھلک کی آج بھی آنکھ سوالی ہے
برسوں سے نینوں کا کاسہ خالی ہے

جب ہم دونوں مٹی سے تخلیق ہوئے
پھر تجھ میں کیا ایسی بات نرالی ہے

اچھا اچھا اس لڑکی کا پوچھتے ہو
وہ لڑکی تو کچھ کچھ دیکھی بھالی ہے

کس کے آگے جا کے میں فریاد کروں
دو آنکھوں نے میری نیند چرا لی ہے

امشب میں بھی جشنِ خواب مناؤں گا
تم سے ملنے کی ترکیب نکالی ہے

بینائی کا فیصلہ ہونے والا ہے
میں نے اک سورج سے آنکھ ملا لی ہے

ارشدؔ ایک نہ اک دن پتھر بولے گا
یا پھر یہ سب میری خام خیالی ہے

○

خودی کے زعم میں ایسا وہ مبتلا ہوا ہے
جو آدمی بھی نہیں تھا وہ اب خدا ہوا ہے

وہ کہہ رہا تھا بجھائے گا پیاس صحرا کی
مرا اک ابر کے ٹکڑے سے رابطہ ہوا ہے

تمہارا طرزِ بیاں خوب ہے مگر صاحب
یہ قصہ میں نے ذرا مختلف سنا ہوا ہے

یہ مٹی پاؤں مرے چھوڑتی نہیں ورنہ
فلک کا راستہ بھی سامنے پڑا ہوا ہے

اُسی کے ہاتھ پہ بیعت میں کر کے آیا ہوں
جو بوڑھا پیڑ کڑی دھوپ میں کھڑا ہوا ہے

خراج مانگتا ہے مجھ سے یہ بدن میرا
کہ لوحِ دل پہ ترا نام بھی لکھا ہوا ہے

وہ مجھ کو دیکھ کے رستہ بدل گیا ارشدؔ
ذرا سی دیر میں اس کو یہ جانے کیا ہوا ہے

○

ایسے بھی آزار اٹھانا ٹھیک نہیں
احسانوں کا بار اٹھانا ٹھیک نہیں

نادانی میں دشمن سے مل بیٹھے ہیں
یاروں پر تلوار اٹھانا ٹھیک نہیں

بوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دیوار اٹھانا ٹھیک نہیں

ناچ رہی ہے مجبوری ان آنکھوں میں
ہونٹوں سے اقرار اٹھانا ٹھیک نہیں

الجھی راہیں اندیشوں میں لپٹی ہیں
کاندھوں پر گھر بار اٹھانا ٹھیک نہیں

میں یہ سوچ کے آنسو پینے لگتا ہوں
آنکھوں میں انگار اٹھانا ٹھیک نہیں

کیسی چاہت ارشد فانی دنیا کی
سر پہ یوں سنسار اٹھانا ٹھیک نہیں

O

ایسے بھی آزار اٹھانا ٹھیک نہیں
احسانوں کا بار اٹھانا ٹھیک نہیں

نادانی میں دشمن سے مل بیٹھے ہیں
یاروں پر تلوار اٹھانا ٹھیک نہیں

بوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دیوار اٹھانا ٹھیک نہیں

ناچ رہی ہے مجبوری ان آنکھوں میں
ہونٹوں سے اقرار اٹھانا ٹھیک نہیں

الجھی راہیں اندیشوں میں لپٹی ہیں
کاندھوں پر گھر بار اٹھانا ٹھیک نہیں

میں یہ سوچ کے آنسو پینے لگتا ہوں
آنکھوں میں انگار اٹھانا ٹھیک نہیں

کیسی چاہت ارشدؔ فانی دُنیا کی
سر پہ یوں سنسار اٹھانا ٹھیک نہیں

○

عدو سمجھتا ہوں جس کو اسی کا یار بھی ہوں
چھپا ہوا ہوں زمانے پہ آشکار بھی ہوں

لبادہ اوڑھ کے رکھتا ہوں میں روایت کا
خیالِ دشت کا اک شتر بے مہار بھی ہوں

میں اپنے آپ سے کر سکتا ہوں دغا بازی
اور ایک وصف ہے مجھ میں وفا شعار بھی ہوں

وہ ایک شخص کہ جس سے ہوں کچھ گریزاں بھی
اسی کے واسطے کچھ کچھ میں بے قرار بھی ہوں

حقیر ذات کو میری تو جانتا ہے مگر
کسی کے سامنے میں سب سے پُر وقار بھی ہوں

بساطِ زیست پہ اس نے مجھے یوں رکھا ہے
کہیں ہوں میں جو پیادہ تو شہسوار بھی ہوں

یہ میرا دین یہ مذہب غرور ہے ارشدؔ
عمل یہ دیکھ کے اپنے میں شرمسار بھی ہوں

○

کٹتے ہی ڈور سانس کی نام و نمود خاک
ہونا ہے ایک روز یہ قصرِ وجود خاک

ٹوٹا کسی کا دل جو گرا دوسری طرف
میزان میں پڑا ترا رختِ سجود خاک

تجسیم کر رہا ہے وہ دستِ کمال ہے
آتش پرست، دہریے، مسلم، ہنود خاک

اس محفلِ طرب میں نہیں چاشنی کوئی
دل میں رمق نہ ہو اگر بزمِ سرود خاک

بڑھنے لگے ہیں چار سو رسموں کے دائرے
ٹھوکر لگا کے پاؤں کی کر دوں قیود خاک

یہ قوم ان ہی راستوں پہ چل پڑی ہے پھر
جن پر ہوئیں تھیں ایک دن عاد و ثمود خاک

سینے میں کوئی آگ ہے ارشدؔ لگی ہوئی
ورنہ ہماری آنکھ سے اٹھتا یہ دود خاک

o

نمودِ ذات کے اس مرحلے سے پہلے بھی
تو میری سوچ میں تھا رابطے سے پہلے بھی

ہر ایک گام اذیت ہے آبلہ پائی
بچھڑ گیا تھا میں اک قافلے سے پہلے بھی

ذرا سی دور لٹیروں کی ایک بستی ہے
گزر چکا ہوں میں اس راستے سے پہلے بھی

زمیں کی خاک کبھی آسماں نہیں چھوتی
مجھے تھی اس کی خبر زائچے سے پہلے بھی

کچھ اس طرح سے وہ بچھڑا کہ بجھ گئیں آنکھیں
نظر میں ناچے بہت دائرے سے پہلے بھی

کمال شیشہ گری کا نہیں کوئی اس میں
شبیہ آنکھ میں تھی آئینے سے پہلے بھی

کہ اب کی بار اسے بڑھ کے روک لو ارشدؔ
گزر گیا تھا کوئی سامنے سے پہلے بھی

○

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا

وہ جو فٹ پاتھ پر اوندھا پڑا ہے
کبھی اس شخص کا بھی گھر رہا تھا

اُسی کا عکس اس کے سامنے تھا
مگر وہ آئینے سے ڈر رہا تھا

محبت میں ہوئی ناکامیوں کا
وہ ہر الزام مجھ پہ دھر رہا تھا

بدن کی ریت اُڑنا چاہتی تھی
میں صحرا آنسوؤں سے بھر رہا تھا

سکوں کی نیند اس کو بھی نہ آئی
اِدھر بے چین میں شب بھر رہا تھا

انا اک درمیاں حائل تھی ارشدؔ
لبِ دریا جو پیاسا مر رہا تھا

۵

سجا کر تکمیل سارا اس زمیں پہ
بسیرا کر لیا عرشِ بریں پہ

زمانہ خوف کھاتا کس لیے ہے
فقط محراب ہے میری جبیں پہ

اگر تو قتل میں شامل نہیں تھا
تو چھینٹے کس لیے ہیں آستیں پر

میں ہجرت کر کے آدھا رہ گیا ہوں
کہ آدھا چھوڑ آیا ہوں وہیں پر

کتابوں میں رکھا کرتے تھے ہم بھی
کہیں تتلی کہیں ٹوٹے حسیں پر

کوئی اے کاش مجھ کو ڈھونڈ لائے
میں خود کو بھول آیا ہوں کہیں پر

اسے ارشدؔ بھلانا چاہتا ہوں
میں چاہوں بھی بھلا سکتا نہیں پر



زخم اس دل کا نشانی میں کہاں سے آیا
پھر لہو آنکھ کے پانی میں کہاں سے آیا

ماسوا عشق کے ہر چیز فنا ہوتی ہے
یہ مگر عالمِ فانی میں کہاں سے آیا

آؤ دو چار قدم چل کے ذرا دیکھتے ہیں
پھول بہتے ہوئے پانی میں کہاں سے آیا

ایک لقمہ بھی میسر ہے تو کر شکر ادا
تو نہیں سوچ گرانی میں کہاں سے آیا

اس کو کہتے ہیں اماوس کی سیہ رات اگر
چاند اس جھیل کے پانی میں کہاں سے آیا

دیکھ کر تجھ کو یہی سوچ رہا ہوں ارشدؔ
تیرا کردار کہانی میں کہاں سے آیا

○

سوائے جس کے کوئی زندگی میں تھا ہی نہیں
اسے یقین مری دوستی میں تھا ہی نہیں

یہ کوئی اور طلب پانیوں میں لے آئی
مرا خیال کسی جل پری میں تھا ہی نہیں

میں ایک بزمِ طرب سے نکل کے آیا ہوں
سرورِ ہجر کسی راگنی میں تھا ہی نہیں

اسی کا پوچھتا ہوں ہر گزرنے والے سے
ترا مکان کہ جو اس گلی میں تھا ہی نہیں

مرے کلام کو پڑھ کر ہوا خفا مجھ سے
وہ جس کا ذکر مری شاعری میں تھا ہی نہیں

بس اک سکوتِ مسلسل تھا چار سو میرے
کوئی خیال کی بارہ دری میں تھا ہی نہیں

چمکتی دھوپ میں قدموں سے اگ پڑا ارشدؔ
جو سایہ ساتھ مرے تیرگی میں تھا ہی نہیں



جنونِ شوق کسی مرحلے میں تھا ہی نہیں
کوئی چناب مرے راستے میں تھا ہی نہیں

کھڑا تھا سامنے اُس کے مگر تعجب ہے
کہ مرا عکس کہیں آئینے میں تھا ہی نہیں

اندھیرا بانٹنے آیا تھا رنج و غم اس کے
چراغِ شام کہ جو طاقچے میں تھا ہی نہیں

شبِ طویل بھی کاٹی ہے خود کلامی سے
کوئی شریک مرے رتجگے میں تھا ہی نہیں

ہر ایک کال پہ اس کا گماں گزرتا ہے
جو ایک شخص کبھی رابطے میں تھا ہی نہیں

سزائیں کاٹنی تھیں عمر بھر مجھے لیکن
مرا بیان کسی فیصلے میں تھا ہی نہیں

مجھے تھی گمشدہ منزل کی جستجو ارشدؔ
کہ میرا دھیان کسی آبلے میں تھا ہی نہیں

o

شام لمحوں میں ڈھل بھی سکتی ہے
دھوپ چہرہ بدل بھی سکتی ہے

راہ مشکل ہے ریگزاروں کی
سوچ لینا تو چل بھی سکتی ہے

تو جو چاہے تو لڑکھڑاتی ہوئی
میری کشتی سنبھل بھی سکتی ہے

لازمی تو نہیں تصادم ہو
موت رستہ بدل بھی سکتی ہے

میں نے سورج سے دوستی کر لی
اب تو دُنیا یہ جل بھی سکتی ہے

گرم سانسوں کا لمس پاتے ہی
کچھ طبیعت مچل بھی سکتی ہے

ہم نے ارشدؔ کبھی نہ سوچا تھا
دل میں حسرت یوں پل بھی سکتی ہے

o

کیوں چبھوتا ہے خار سینے میں
کوئی خنجر اتار سینے میں

اس لیے شعر کہنے لگتا ہوں
بڑھ نہ جائے غبار سینے میں

آگ پھر سے بھڑک بھی سکتی ہے
کچھ دبے ہیں شرار سینے میں

پھول مہکے ہیں تیری یادوں کے
خوب آئی بہار سینے میں

اک مکیں نے جو دل سے ہجرت کی
پھر نہ آیا قرار سینے میں

اس لیے ایک ہی محبت کی
ایک ہی دل تھا یار سینے میں

دفن میں نے کیے ہیں یاروں کے
راز ارشدؔ ہزار سینے میں

O

چشمِ حیراں سے دیکھتا کوئی ہے
اس خرابے میں دوسرا کوئی ہے

عقل منکر ہوئی تو دل میرا
مجھ سے کہنے لگا خدا کوئی ہے

تجھ کو ایسے ہی سوچتا ہوں میں
پیاسا پانی کو سوچتا کوئی ہے

یعنی تم نے مجھے پکارا ہے
یعنی مجھ کو بھی جانتا کوئی ہے

تجھ کو دیکھوں تو ایسا لگتا ہے
روبرو جیسے آئینہ کوئی ہے

اک نظر کا سوال ہے بابا
در پہ کاسہ لیے کھڑا کوئی ہے

سب کو دشمن بنا لیا ارشدؔ
تیرے جیسا بھی سر پھرا کوئی ہے

○

اس میں کیا بات مری جان وضاحت کی ہے
صاف آنکھوں میں لکھا ہے کہ محبت کی ہے

پاؤں پکڑے تھے بہت گاؤں کی مٹی نے مرے
کتنی مشکل سے ترے شہر کو ہجرت کی ہے

لوگ اب ایسے وفاؤں کا صلہ مانگتے ہیں
جیسے الفت بھی کوئی جنس تجارت کی ہے

مری معصوم سی چڑیا نہ عقابوں سے الجھ
تجھ کو اک دوست سمجھ کر یہ نصیحت کی ہے

تب کہیں جا کے وہ اندر کا ہے کافر نکلا
روز معصوم سے چہرے کی تلاوت کی ہے

تو نے جو آج نگاہوں سے گرایا ہے مجھے
یہ گھڑی مجھ پہ مری جان قیامت کی ہے

میں نے ارشدؔ جسے ہمراز بنا رکھا تھا
آج کیا سوچ کے اس نے بھی عداوت کی ہے

○

درد جب ہو فزوں کہانی میں
رنگ آتا ہے یوں کہانی میں

میرا کردار چیخ اٹھتا ہے
ہونٹ جب بھی سیوں کہانی میں

کارِ دشوار یوں نبھاتا ہوں
روتے روتے ہنسوں کہانی میں

کوئی کردار جب نہیں باقی
کس طرح میں رہوں کہانی میں

دیپ سارے بجھا دیئے جائیں
جب میں مرنے لگوں کہانی میں

میری میت کو تو جو بوسہ دے
پھر سے میں جی اٹھوں کہانی میں

آنکھوں آنکھوں میں دل کی باتیں ہوں
تو کہے میں سنوں کہانی میں

میں حقیقت میں مر گیا ارشدؔ
پھر بھی زندہ تو ہوں کہانی میں



میں نے اُسی سے ہاتھ ملایا تھا اور بس
وہ شخص جو ازل سے پرایا تھا اور بس

لمبا سفر تھا آبلہ پائی تھی دھوپ تھی
میں تھا تمہاری یاد کا سایہ تھا اور بس

حدِ نگاہ چار سو کرنوں کا رقص تھا
پہلو میں چاند جھیل کے آیا تھا اور بس

اک بھیڑیا تھا دوستی کی کھال میں چھپا
اس نے مرے وجود کو کھایا تھا اور بس

پھر یوں ہوا ہوائیں تھیں رقصاں تمام رات
اک طاقچے میں دیپ جلایا تھا اور بس

اس کارزارِ زیست میں ہم نے تمام عمر
ارشدؔ کسی کا عشق کمایا تھا اور بس



چشم نمناک میں اُگی بارش
پھر بڑی دیر تک ہوئی بارش

دل سمندر سے بن گیا صحرا
تو نے بخشی نہ پیار کی بارش

کشتِ دل پر تمہاری یادوں کی
روز ہوتی ہے ریشمی بارش

جسم بنجر تھا ہوگیا جل تھل
اس نے ہونٹوں سے جب لکھی بارش

دلِ مضطر کے سب کھلونے ہیں
تتلیاں، پھول، جل پری بارش

شام ڈھلنے پہ آگئی ارشد
اور اب تک نہیں تھمی بارش

O

الجھتا ہے مرا کردار مجھ سے
کہ چاہے کیا کہانی کار مجھ سے

وہی برسوں کا بوسیدہ سا چہرہ
ہوا ہے آئینہ بے زار مجھ سے

اسے میں رازداں کرنے لگا تھا
لپٹ کے رو پڑی دیوار مجھ سے

وہ اک بوسہ مری نس نس میں اترا
کہ آتی ہے تری مہکار مجھ سے

زباں کی بیج سے قربت بڑھ رہی ہے
خفا سب ہو گئے ہیں یار مجھ سے

یہ ممکن تھا لڑائی جیت جاتا
وفا کرتی نہ گر تلوار مجھ سے

مقابل پُل صراطِ ہجر ارشدؔ
نجانے کیسے ہوا اب پار مجھ سے

O

جو سورج کی تمازت بڑھ گئی ہے
گھٹاؤں کی ضرورت بڑھ گئی ہے

مجھے اک جل پری نے چھو لیا تھا
مری سانسوں کی حدت بڑھ گئی ہے

ہر اک منظر میں تجھ کو کھوجتا ہوں
بچھڑنے سے محبت بڑھ گئی ہے

چراغوں کو جلانے کی لگن میں
ہواؤں سے عداوت بڑھ گئی ہے

تو کیا یہ وقت واپس جا رہا ہے
زمانے میں جہالت بڑھ گئی ہے

مرے مالک عطا کچھ اور بھی ہو
مقدر سے ضرورت بڑھ گئی ہے

نجانے کیا وبا پھیلی ہے ارشدؔ
دلوں میں اب کدورت بڑھ گئی ہے

O

شکستہ دل میں فرقت ناچتی ہے
سرِ مژگاں اذیت ناچتی ہے

عجب میلہ لگا ہے نفرتوں کا
جدھر دیکھو کدورت ناچتی ہے

ترے طرزِ تکلم میں نہیں وہ
جو آنکھوں میں شرارت ناچتی ہے

ابھی کچھ دن مناجاتیں رہیں گی
ابھی سر پر مصیبت ناچتی ہے

بنا گھنگھرو تمہارے آستاں پر
کسی بے کس کی حاجت ناچتی ہے

سرِ محفل ہے کوئی محوِ رقصاں
پسِ پردہ ضرورت ناچتی ہے

بھرے دو گھونٹ اس ندیا سے ارشدؔ
مرے ہونٹوں پہ لذت ناچتی ہے

○

ملے گا اس کا مجھے کیا، اٹھا کے لایا ہوں
پرانے وقت کا سکہ اٹھا کے لایا ہوں

تمہاری تشنگی دیکھی نہیں گئی مجھ سے
میں اپنی اوک میں دریا اٹھا کے لایا ہوں

شبِ سیاہ میں کچھ تو مجھے سہولت ہو
کسی کی یاد کا تارا اٹھا کے لایا ہوں

جو ہو سکے تو ذرا مختلف بنا اب کے
میں قصرِ ذات کا ملبہ اٹھا کے لایا ہوں

یہ پیاس علم کی کچھ تو بجھایئے صاحب
بڑے جتن سے میں بستہ اٹھا کے لایا ہوں

حوالے دھوپ کے جس نے مجھے کیا اک دن
اسی کے واسطے سایہ اٹھا کے لایا ہوں

تمام اشک سرابوں میں ڈھل گئے ارشدؔ
شکستہ آنکھ میں صحرا اٹھا کے لایا ہوں

○

ذرا نمناک ہونا چاہیے تھا
فلک بھی خاک ہونا چاہیے تھا

وجودِ آدمیت آدمی کے
پسِ پوشاک ہونا چاہیے تھا

بدلتے موسموں کے تیوروں کا
ہمیں ادراک ہونا چاہیے تھا

مرا کردار مرتا جا رہا ہے
مجھے غمناک ہونا چاہیے تھا

جسے دستار سونپی جا رہی تھی
اسے بیباک ہونا چاہیے تھا

کنارا دوسرا گر دیکھنا ہے
تو پھر تیراک ہونا چاہیے تھا

نہیں ہو تم زمانہ ساز ارشدؔ
تمہیں چالاک ہونا چاہیے تھا



لہکتا ساز ہونا چاہیے تھا
پسِ آواز ہونا چاہیے تھا

ہماری داستانِ زندگی کا
کہیں آغاز ہونا چاہیے تھا

اُلجھ کر راستے میں سوچتا ہوں
کوئی دمساز ہونا چاہیے تھا

وہ کرگس کی اطاعت کر رہا ہے
جسے شہباز ہونا چاہیے تھا

ترے در پر قلندر آ کھڑا ہے
تجھے تو ناز ہونا چاہیے تھا

بساطِ زیست

ہوا کو چیرنے کا حوصلہ بھی
دمِ پرواز ہونا چاہیے تھا

میں نقشے کے نشاں تک آ گیا ہوں
یہیں پہ راز ہونا چاہیے تھا

حیاتِ رائیگاں کا ایک لمحہ
کہ پس انداز ہونا چاہیے تھا

سمجھتے تھے جسے ہمزاد ارشدؔ
اسے ہمراز ہونا چاہیے تھا

○

پہلے اس کی آنکھوں کو تصویر کیا
اور پھر سارے خوابوں کو تعبیر کیا

دکھ سے میرا سینہ شل ہو سکتا تھا
میں نے اُس کو شعروں میں تحریر کیا

روز و شب جنات سے لڑنا پڑتا ہے
ایک پری کے دل کو تھا تسخیر کیا

اس نے پیار کو کتنا ارزاں سمجھا تھا
زر سے جس نے تاج محل تعمیر کیا

ڈوب گیا تھا ہر منظر تاریکی میں
ایک دیے کی لو نے سب تنویر کیا

آج پرانا البم کھول کا بیٹھا تھا
بھولی بسری یادوں نے دلگیر کیا

ارشد دل کی الجھن بڑھتی جاتی ہے
چھوٹی چھوٹی باتوں کو گمبھیر کیا

○

صرف کارِ زیاں سمجھتے ہیں
لوگ چاہتے کہاں سمجھتے ہیں

تیکھی باتوں کو چھوڑیئے صاحب
ہم تو میٹھی زباں سمجھتے ہیں

کیسے تیور ہیں ان ہواؤں کے
یہ فقط بادباں سمجھتے ہیں

ہار جاتے ہیں ہم مروت میں
وہ ہمیں ناتواں سمجھتے ہیں

تیرے لہجے کی اس بناوٹ کو
یار حسنِ بیاں سمجھتے ہیں

اجنبی دیس میں مسافر کا
مسئلہ بے مکاں سمجھتے ہیں

پیڑ کرتے ہیں گفتگو ارشدؔ
پنچھی ان کی زباں سمجھتے ہیں

○

صرف کارِ زیاں سمجھتے ہیں
لوگ چاہتے کہاں سمجھتے ہیں

تیکھی باتوں کو چھوڑیئے صاحب
ہم تو میٹھی زباں سمجھتے ہیں

کیسے تیور ہیں ان ہواؤں کے
یہ فقط بادباں سمجھتے ہیں

ہار جاتے ہیں ہم مروت میں
وہ ہمیں ناتواں سمجھتے ہیں

تیرے لہجے کی اس بناوٹ کو
یار حسنِ بیاں سمجھتے ہیں

اجنبی دیس میں مسافر کا
مسئلہ بے مکاں سمجھتے ہیں

پیڑ کرتے ہیں گفتگو ارشدؔ
پنچھی ان کی زباں سمجھتے ہیں

٥

میں جانتا ہوں مرے یار گرنے والی ہے
شکستہ جسم کی دیوار گرنے والی ہے

غریبِ شہر کی پگڑی اچھالنے والو
تمہارے سر سے بھی دستار گرنے والی ہے

رعایا نیند سے بیدار ہو گئی جب بھی
تو پھر یہ ظلم کی سرکار گرنے والی ہے

دعائے ابر بھی مانگی نہیں گئی مجھ سے
کہ میری جھونپڑی اس بار گرنے والی ہے

تھپیڑے تیز ہواؤں کے اس طرح کھائے
کہ ٹوٹی شاخ لچک دار گرنے والی ہے

مدار چھوڑ کے یکدم لرزتی ہے ایسے
زمیں خلاؤں کے اس پار گرنے والی ہے

ہمارا وار نشانے پہ لگ گیا ارشدؔ
عدو کے ہاتھ سے تلوار گرنے والی ہے

○

ایسا گہرا سناٹا تھا آنکھوں میں
ایک سمندر ڈوب گیا تھا آنکھوں میں

اب جالوں سے بینائی دھند لائی ہے
برسوں پہلے خواب بنا تھا آنکھوں میں

میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی
اس نے میرا عکس بھرا تھا آنکھوں میں

کل بھی کچی نیند سے میں بیدار ہوا
کل بھی کوئی خواب مرا تھا آنکھوں میں

جانے والے آنکھیں نوچ کے لے جا تو
ہم نے تیرا نام لکھا تھا آنکھوں میں

اک بیٹے کی لاش پہ ماں یوں روئی تھی
جیسے چشمہ پھوٹ پڑا تھا آنکھوں میں

بنتِ حوا کی ارشدؔ مجبوری تھی
جاتے جاتے اس نے کہا تھا آنکھوں میں

○

یوں طنابیں کٹ گئیں ہیں ساز کی
اِک تڑپتی روح نے پرواز کی

کان میں گونجے گی ظالم! بد دُعا
سسکیاں لیتی ہوئی آواز کی

جان، جانِ آفریں کو سونپ دی
اب ضرورت کیا کسی دمساز کی

جس کے دل میں حبِ اہلِ بیت ہو
موت ملتی ہے اسے اعزاز کی

ایک دن چھو سکتا ہے وہ آسماں
طاقتِ پر جس میں ہو شہباز کی

سرخرو ایسا ہوا ہوں عشق میں
ایک دھڑکن بھی نہ پس انداز کی

کب شہادت کھول کر بانہیں ملے
بات ارشد یہ تو ہے سب راز کی

○

حدودِ چشم کسی حاشیے سے باہر ہے
مرا یقین ترے واہمے سے باہر ہے

ہتھیلی دیکھ کے میری یہ جوتشی نے کہا
ترا نصیب ترے زائچے سے باہر ہے

کوئی تو سانحہ گزرا ہے اس پرندے پر
کہ آدھی رات کو جو گھونسلے سے باہر ہے

یہ دل اُسی کی طلب میں رہا ہے شام و سحر
مگر وہ شخص مرے دائرے سے باہر ہے

تمہاری دید کی خواہش ہی کھینچ لائی ہے
تمہارا گاؤں مرے راستے سے باہر ہے

اُتر گیا ہے وہ آنکھوں کے راستے دل میں
کسی کا عکس کہ جو آئینے سے باہر ہے

اسے ہے کون سی منزل کی جستجو ارشدؔ
وہ ایک شخص کہ جو قافلے سے باہر ہے

O

کوئی وہم گماں میں تھا مرے ایقان سے پہلے
عجب پہچان تھی اس کی کسی پہچان سے پہلے

محبت میں خسارے پر گریباں چاک پھرتے ہو
ذرا سا سوچ لینا تھا میاں نقصان سے پہلے

کسی کی خوشنما سانسوں سے اب آنگن مہکتا ہے
بہت ویران تھا یہ گھر مرا مہمان سے پہلے

تمہارا لمس پاتے ہی یہ جسم و جاں ہوئے جل تھل
وگرنہ ہر گھڑی رہتے تھے ہم بے جان سے پہلے

جو دل کی بات دل میں ہے لبوں تک وہ نہیں آئی
نگاہیں کہہ رہی تھیں کچھ تری مسکان سے پہلے

ہمیں نے دشت اُلفت کو عطا کی ہے یہ رعنائی
وگرنہ اس کے رستے تھے بہت سنسان سے پہلے

امن کے گلستاں کو ہم نے ارشدؔ خود اُجاڑا ہے
جہاں تھا پرسکون و بے خطر انسان سے پہلے



آئنہ جب کبھی ملا ہے مجھے
چشمِ حیراں سے دیکھتا ہے مجھے

اس نے اشکوں کی روشنائی سے
کورے کاغذ پہ لکھ دیا ہے مجھے

ترکِ دنیا کا جب ارادہ ہو
میرا ہمزاد روکتا ہے مجھے

کشتیِ جاں بھنور میں ہے لیکن
تیری یادوں کا آسرا ہے مجھے

تو کہ واقف نہیں تعجب ہے
اک زمانہ تو جانتا ہے مجھے

جانے سورج کو کیا ہوا ارشدؔ
سرخ آنکھوں سے گھورتا ہے مجھے

○

کوئی سمجھے تو زباں اس کی وہ کیا بولتا ہے
لوگ کہتے ہیں محبت کا خدا بولتا ہے

جشنِ آشوب مناتی ہوئی اے تیرہ شبی
میری کٹیا میں ابھی ایک دیا بولتا ہے

آج اس نے ہی محبت سے پکارا ہے یا پھر
اس کے لہجے میں کوئی اس کے سوا بولتا ہے

جل پری مجھ کو بلاتی ہے کہ پانی میں اتر
میرا ہمزاد کنارے پہ کھڑا بولتا ہے

اجنبی دیس کا باسی ہے اسی واسطے تُو
میری بستی کے مکینوں سے جدا بولتا ہے

ہر گھڑی شور سا اٹھتا ہے مرے سینے میں
کوئی پنچھی ہے جو پنجرے میں پڑا بولتا ہے

اب جو آتیں ہیں اناالحق کی صدائیں ارشدؔ
میں نہیں بولتا بس میرا خدا بولتا ہے



حوصلے دیکھئے شناور کے
روبرو ہے کھڑا سمندر کے

نیند آنکھوں سے جب گریزاں ہو
ناز کیسے اٹھاؤں بستر کے

زورِ بازو کسی نے کیا جیتا
کھیل ہوتے ہیں سب مقدر کے

جس نے پیکر ترا تراشا ہے
جاؤں صدقے میں ایسے آزر کے

تیرا کوچہ میں چھوڑ آیا ہوں
اب تو جینا پڑے گا مر مر کے

میں جو ٹکڑوں میں بٹ گیا ارشدؔ
یار ملتے رہے ہیں پتھر کے

O

نصیب قیس کا ادراک مجھ میں
اُتارے درد کے افلاک مجھ میں

ترے دم سے ہے رونق جسم و جاں کی
وگرنہ اڑ رہی تھی خاک مجھ میں

میں فطری طور پر معصوم ہی تھا
سرایت کر گیا چالاک مجھ میں

کسی کی جھیل آنکھیں کہہ رہی تھیں
کئی گم ہوگئے پیراک مجھ میں

درندے غم کے دل کو نوچتے ہیں
عجب رکھی گئی خوراک مجھ میں

مکانِ جسم تو اجڑا ہوا ہے
مگر یادوں کی ہے املاک مجھ میں

نمی پلکوں سے جائے بھی تو کیسے
ہے ارشدؔ روز شب غمناک مجھ میں

○

نمودِ ذات کا ایقان مجھ میں
مثالِ جامِ جم و جدان مجھ میں

حریمِ ذات میں آہ و فغاں ہے
کہ سارے مر گئے ارمان مجھ میں

خزاں کا رقص بڑھتا جا رہا ہے
کہ سوکھے پڑ گئے گلدان مجھ میں

میں اک ایسی کہانی ہوں کہ جس کا
کہیں گم ہوگیا عنوان مجھ میں

درِ بت پر جبیں رکھتا نہیں ہوں
دھڑکتا ہے ابھی ایمان مجھ میں

یہ قصرِ جسم و جاں اجڑا ہوا ہے
چڑیلیں یاد کی مہمان مجھ میں

خدائے کبریا ہے دل میں ارشدؔ
در آئے کس طرح شیطان مجھ میں



کتنی شدت سے کپکپائے ہونٹ
سرد ہونٹوں سے جب ملائے ہونٹ

تیری زلفیں بنائیں ریشم سے
رب نے کلیوں سے ہیں بنائے ہونٹ

نام غیروں کا جب بھی لیتے ہیں
لگنے لگتے ہیں تب پرائے ہونٹ

میرا تشنہ بدن کرو جل تھل
تم تو رکھتے ہو آبنائے ہونٹ

آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا اس نے
دھیرے دھیرے سے مسکرائے ہونٹ

یاد آیا وہ گل بدن ارشدؔ
میں نے پھولوں سے جا لگائے ہونٹ

○

ایک بس تیری طلب کی ہے تو کیا کیا چھوڑا
راہِ الفت پہ چلا یوں کہ زمانہ چھوڑا

میرے اس عزم کو دیکھا تو فلک بوس کئی
آڑھی ترچھی سی چٹانوں نے بھی رستہ چھوڑا

جب بھی روٹھے ہو تمہیں ہم نے منایا ہے مگر
تم نے عادت ہی بنا لی سو منانا چھوڑا

سورۂ الناس پڑھی اور پڑھی سورۂ جن
پھر بھی یادوں کی چڑیلوں نے نہ پیچھا چھوڑا

دھول راہوں کی ہوا ہوں میں تمہارے کارن
اے میاں عشق نہیں تم نے کہیں کا چھوڑا

شاخ سے لپٹا ہوا سانپ دکھائی جو دیا
خوف ایسا تھا کہ پنچھی نے ٹھکانہ چھوڑا

یہ بھی معلوم ہے ارشد وہ نہیں آئے گا
میں نے پھر بھی نہیں راہوں کو سجانا چھوڑا

○

جب فصیلِ وقت پر کچھ سانحے رہ جائیں گے
داستانِ زندگی کے تذکرے رہ جائیں گے

جانے والے کاش اتنا سوچ لیتا تو کبھی
اس شبِ تاریک میں سب در کھلے رہ جائیں گے

منزلوں کی جستجو میں چل پڑیں گے کارواں
گرد میں لپٹے ہوئے یہ راستے رہ جائیں گے

آؤ مل کر دور کرتے ہیں سبھی شکوے گلے
بدگمانی بڑھ گئی تو وسوسے رہ جائیں گے

اس کو مل جائے گی گاڑی جس نے تھاما وقت کو
دیر سے پہنچے مسافر دیکھتے رہ جائیں گے

ایک دن اس زندگانی کی غزل ہوگی تمام
جو نہ باندھے جا سکے وہ قافیے رہ جائیں گے

نیند سے آنکھوں کی ارشدؔ چپقلش اچھی نہیں
دوریاں بڑھتی رہیں تو رتجگے رہ جائیں گے

○

اُس نے کچھ تو کہا پرندوں سے
جاگ اٹھی فضا پرندوں سے

روز ٹوٹی ہے آس کی ڈوری
روز پوچھا ترا پرندوں سے

قید سانس نچوڑ لیتی ہے
جال کہنے لگا پرندوں سے

غم کے پنچھی ہیں دل کی شاخوں پر
خوب پائی وفا پرندوں سے

آسماں کی لگن نہیں اچھی
کہہ رہی تھی ہوا پرندوں سے

تم جو آنکھیں بدلنے لگتے ہو
خوب سیکھی ادا پرندوں سے

لوٹ آئیں گے دیکھنا ارشدؔ
پیار اتنا کیا پرندوں سے

○

جانتے ہیں یہ سب پرندے بھی
زندہ رہنے کے ڈھب پرندے بھی

کٹ کے جب بھی درخت گرتا ہے
پھڑپھڑاتے ہیں تب پرندے بھی

ناز کیسا خدا پرستی پر
مان لیتے ہیں ربّ پرندے بھی

ربّ کی شامل اگر مشیت ہو
خوب ڈھائیں غضب پرندے بھی

اس کا وعدہ ہے رزق دینے کا
بھوکے سوتے ہیں کب پرندے بھی

تم محبت سے گر سکھاؤ تو
سیکھ لیں گے ادب پرندے بھی

دل کی پھوٹی ہی کونپلیں ارشدؔ
چہچہائیں گے اب پرندے بھی



چراغِ دل بجھانا پڑ گیا ہے
کہ خود کو آزمانا پڑ گیا ہے

یہ کشتِ دل اجڑتی جا رہی تھی
پرندوں کو اُڑانا پڑ گیا ہے

شبِ تاریک اٹھلانے لگی تھی
نیا سورج اُگانا پڑ گیا ہے

یہی پاداش ہے سچ بولنے کی
مرے پیچھے زمانہ پڑ گیا ہے

میں ایسے بت کدے میں آ گیا ہوں
جہاں سر کو جھکانا پڑ گیا ہے

مرا کردار جس میں مر گیا تھا
وہی قصہ سنانا پڑ گیا ہے

تبھی رختِ سفر باندھا ہے ارشد
کوئی وعدہ نبھانا پڑ گیا ہے



وہ جو اک شخص خیالوں میں نظر آتا ہے
آنکھ لگتے ہی مرے خواب میں در آتا ہے

میں ترے گاؤں سے پہلے بھی کبھی گزرا ہوں
ہاں اسی موڑ پہ اک بوڑھا شجر آتا ہے

اس لیے سر پہ اٹھایا ہے یہ غم کا سورج
دھوپ پڑتی ہے تو پیڑوں پہ ثمر آتا ہے

سوئے منظر کو جگا دیتی ہیں ہنستی کرنیں
چاند جب جھیل کے پانی میں اتر آتا ہے

زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے

تجھ کو ارشدؔ میں بتاتا ہوں حقیقت اس کی
مرا وجدان ابھی لے کے خبر آتا ہے

ㅇ

بے سبب تو نہیں آہوں کی نوا گونجتی ہے
چوٹ پڑتی ہے تو ڈھولک کی صدا گونجتی ہے

چار سو وحشت و ہیبت کے سوا کچھ بھی نہیں
دشتِ دل میں تری یادوں کی ہوا گونجتی ہے

حوصلہ توڑ نہ پائے گی شبِ ہجر کبھی
دل میں اک آس کے جگنو کی ضیا گونجتی ہے

میں جو ہر بار مصیبت سے نکل آتا ہوں
میرے کانوں میں مری ماں کی دعا گونجتی ہے

اک نیا عشق مجھے گھیرنے آیا ہے مگر
بجھتی آنکھوں میں ابھی پہلی خطا گونجتی ہے

خواہشیں شور مچاتی ہیں مرے دل میں کئی
ایک بس تیری طلب سب سے جدا گونجتی ہے

جن پہ ہوتے تھے عقابوں کے نشیمن ارشدؔ
ان چٹانوں پہ بھی کرگس کی ندا گونجتی ہے

○

چاند تارے اور نظارے کچھ نہیں
فی زمانہ بن تمہارے کچھ نہیں

اس بساطِ عشق پہ سب لٹ گیا
پھر بھی لگتا ہے کہ ہارے کچھ نہیں

ایک بوسے کی اجازت بھی نہ دی
صاف کہہ دو ہم تمہارے کچھ نہیں

وہ جو پھولے ہیں کسی کی سانس پر
سب دکھاوا ہے غبارے کچھ نہیں

کس جزیرے پر اتر آیا ہوں میں
رقصِ وحشت ہے کنارے کچھ نہیں

ایک موسم میں گھری ہے زندگی
رت بدلنے کے اشارے کچھ نہیں

روزِ محشر امتحاں کس بات کا
ہاتھ میں ارشدؔ ہمارے کچھ نہیں

○

سرد جذبوں میں حرارت کچھ نہیں
یہ دکھاوے کی محبت کچھ نہیں

یوں فضاؤں میں ملاوٹ ہو گئی
سانس لینے میں سہولت کچھ نہیں

ڈھب بدلتی شاعری پہ کیا کہوں
بے تکی باتوں میں جدت کچھ نہیں

ایک بوسے نے عیاں مجھ پر کیا
ساغر و مینا میں لذت کچھ نہیں

دل کے دروازے مقفل ہوں اگر
پھر نمازیں اور تلاوت کچھ نہیں

گردشوں میں ہیں مقدر کے نجوم
سامنے ان کے ذہانت کچھ نہیں

اب تو ارشدؔ ایسا لگتا ہے مجھے
سب فسانہ ہے حقیقت کچھ نہیں

○

چاند، سورج، فلک، کہکشاں کچھ نہیں
بن تمہارے یہ کون و مکاں کچھ نہیں

نوکِ مژگاں ستارے نہ موتی کوئی
ضبط ایسے کیا کہ عیاں کچھ نہیں

ہے تخیل کی پرواز سب سے جدا
سامنے جس کے ہفت آسماں کچھ نہیں

دشت میں اک مسافر ہے بھٹکا ہوا
ریت پہ راستے کے نشاں کچھ نہیں

مثلِ خوشبو ہر اک بات افشا ہوئی
راز سینے میں اب رازداں کچھ نہیں

کھوٹ شامل جو واعظ کی نیت میں ہو
پھر تکلم یہ حسنِ بیاں کچھ نہیں

ایک کردار جب لاپتہ ہو گیا
قصہ گو! سچ کہوں داستاں کچھ نہیں

قصرِ دل راکھ کا ڈھیر کیسے بنا
آگ بھڑکی نہ ارشدؔ دھواں کچھ نہیں



ایک مدت سے جو کاندھوں پہ ہوں صحرا رکھے
سنتِ قیس میاں جگ میں ہوں زندہ رکھے

اس سے کہہ دو ترے رازوں کی حفاظت ہو گی
اس سے کہہ دو مرے وعدوں پہ بھروسہ رکھے

تشنہ ہونٹوں کو لیے اور کہاں جاؤں میں
تو کہ دریا ہے مجھے تو بھی ہے پیاسا رکھے

میری کٹیا کے چراغوں کو بجھانے والے
میرا مالک ترے کمرے میں اجالا رکھے

آؤ ارشدؔ کہیں اب نقل مکانی کر لیں
اس خرابے میں کوئی کیسے بسیرا رکھے

○

کارِ الفت وفا تماشا ہے
حسن کی ہر ادا تماشا ہے

خود تماشا بھی ہے تماشائی
چشمِ بینا بھی کیا تماشا ہے

لوگ کرتے ہیں یوں اداکاری
ہر گلی میں نیا تماشا ہے

دل سے نکلی تو عرش چھو لے گی
لب پہ ٹھہری دعا تماشا ہے

شرم آنکھوں میں ڈوب جائے تو
لاکھ پردے، ردا تماشا ہے

خود بجھا کے ہوا چراغوں کو
سر پٹختا ترا تماشا ہے

عکس مجھ سے اُلجھ پڑا ارشدؔ
آئینے میں بپا تماشا ہے



بزمِ ہجراں سجائی رستے میں
یاد اس کی جب آئی رستے میں

اب تو راہیں بدلنے والی ہیں
بات اس نے بتائی رستے میں

اک محبت تلاشنے کے لیے
عمر ساری گنوائی رستے میں

زندگی کا سفر نہیں رکتا
چھوڑ جاتے ہیں بھائی رستے میں

آ کے منزل پہ کس نے سوچا ہے
کتنی مشکل اٹھائی رستے میں

ایک رہزن نے لوٹ لی ارشدؔ
دن کی ساری کمائی رستے میں

○

قرطاس پہ قلم سے یوں نشتر لگایئے
جب دل بنا لیا ہے تو دھڑکن بنایئے

جل کے میں راکھ ہو بھی چکا ہوں مرے حضور
بہتر یہی ہے آپ مجھے بھول جایئے

آنکھوں سے اپنی اس لیے الجھا ہوں رات بھر
نیندوں کے ساتھ خواب کوئی ہونا چاہیے

بڑھتے ہوئے سکوتؔ کا یوں توڑیے غرور
کوئی غزل تو میرؔ کی اب گنگنایئے

اس نے کہا! خزاؤں میں کھلتے نہیں گلاب
میں نے کہا! کہ آپ ذرا مسکرایئے

طغیانیوں کے شور سے مرعوب کیوں ہوئے
دریا کو گھیر گھار کے صحرا میں لایئے

مِل تو گئی ہے آپ کو میراث قیس کی
ارشد اب اپنے دوش پر وحشت اٹھایئے

○

سورج سے جو ٹوٹی دھوپ
پیڑوں پر ہے اٹکی دھوپ

مدت سے ہوں زنداں میں
مدت سے نہ دیکھی دھوپ

اُلجھ پڑی ہے بادل سے
ہو جائے گی اندھی دھوپ

شام نکلنے والی ہے
چاروں جانب پھیلی دھوپ

صحراؤں میں اتری ہے
کس کے ہجر کی ماری دھوپ

من کے پیڑ کو جھلسائے
تیری یاد کی تپتی دھوپ

کیسے جذبے سرد ہوئے
کیوں ہے ارشدؔ ٹھنڈی دھوپ



طاری رہے گا سوچ پہ وحشت کا بھوت کیا
ٹوٹے گا کسی طور یہ شب کا سکوت کیا

پڑتی نہیں ہے آنکھ کے ساحل پہ سرخ دھوپ
کرتا میں آرزوؤں کے لاشے حنوط کیا

تم نے کہا تو زہر بھی پینا پڑا مجھے
اب اس سے بڑھ کے دوں تمھیں سچ کا ثبوت کیا

کیسے کپاس کے لیے گندم کو چھوڑ دوں
مٹتی نہیں ہے بھوک تو کاتوں میں سوت کیا

میری نظر بھی طالب دیدار ہیر ہے
ملنا پڑے گا جسم پہ مجھ کو بھبوت کیا

ارشد ہمارے ہاتھ سے پھسلے گی ایک دن
پہلے بچا سکا کوئی سانسوں کی ہوت کیا

○

جس نے مالک کی عطاؤں پہ بھروسہ رکھا
اس نے ہر حال میں جینے کا سلیقہ رکھا

زندگی اب تو اماوس کی طرح لگتی ہے
چاند جگنو نہ کوئی تجھ میں ستارہ رکھا

میں نے اک بوند محبت کی فقط مانگی تھی
اور مرے یار نے کشکول میں صحرا رکھا

خیمۂ دل میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری یادوں کے چراغوں نے اجالا رکھا

آج پھر اس سے سر راہ ملاقات ہوئی
آج بھی اس نے ہتھیلی پہ ہے وعدہ رکھا

اس کے دم سے مری تکمیل بھی ہو سکتی تھی
مجھ کو اک شخص نے تا عمر ادھورا رکھا

آگ بھڑکے گی ذرا دیر تو ٹھہرو ارشدؔ
ہم نے سورج کے مقابل میں ہے شیشہ رکھا



خفا مجھ سے ہوا ہے یار میرا
تبھی تو سانس ہے دشوار میرا

وہ جس کو میں نے تھی پہچان بخشی
وہی کرتا ہے اب انکار میرا

پھپھولے دل کے پھوڑوں کس کے آگے
نہیں ہے کوئی بھی غم خوار میرا

غموں کا روگ کھاتا جارہا ہے
بدن ہونے لگا لاچار میرا

کہانی انتہا تک آ گئی ہے
کہیں آیا نہیں کردار میرا

وراثت قیس کی پائی ارشدؔ
بہت ہے راستہ پُرخار میرا



حسرتوں کا جہاں اذیت ہے
کارِ اُلفت میاں اذیت ہے

پتھروں سے کلام کرنا ہے
کیسے کھولوں زباں اذیت ہے

ماند پڑنے لگی ہے بینائی
آنسوؤں کا دھواں اذیت ہے

لاش رکھی ہے اپنی کاندھوں پر
لے کے جاؤں کہاں اذیت ہے

کچھ حقیقت بھی ہو کہانی میں
یونہی وہم و گماں اذیت ہے

خود ہوں ارشدؔ کھڑا نشانے پر
کیسے کھینچوں کماں اذیت ہے



پہلے مجھ کو چاک پر رکھا گیا
پھر غموں کی آگ میں جھونکا گیا

تھی بھلی قسمت ہوا ہوں سرخرو
یوں تو مجھ کو بارہا پرکھا گیا

رفتہ رفتہ سب کے سب کھلتے گئے
دوستوں سے میں جدا ہوتا گیا

یہ عجب کہ سامنے منزل نہ تھی
میں وہاں پہنچا جہاں رستہ گیا

میں وہ بدقسمت سپہ سالار ہوں
سازشِ لشکر میں جو مارا گیا

اک محبت میں جہاں کو تج دیا
پھر بھی ارشدؔ بے وفا سمجھا گیا

○

ڈبو کے خونِ تمنا میں انگلیاں مری جاں
کسی نے درد کی لکھی ہے داستاں مری جاں

ذرا سی دیر میں آنکھیں برسنے والی ہیں
تمہاری یاد کی چمکی ہیں بجلیاں مری جاں

چلو ہم چاند پہ چل کر بسائیں بستی کو
بچھا کے راہ میں تاروں کی کہکشاں مری جاں

یہ زخم دل کے مہکتے گلاب جیسے ہیں
تبھی تو چار سو اڑتی ہیں تتلیاں مری جاں

کسی نے دل میں دبی خواہش کریدی ہیں
حریمِ ذات سے اٹھنے لگا دھواں مری جاں

سنو اے کانچ کی گڑیا وفورِ شوق سے میں
تمہارے واسطے لایا ہوں چوڑیاں مری جاں

ہر ایک بار میں ہوتا ہوں سرخرو ارشدؔ
ہر ایک موڑ پہ لیتی ہے امتحاں مری جاں



خیالِ یار میں کچھ دل کو بے کلی تو ملی
شبِ سیاہ میں یادوں کی روشنی تو ملی

یہ اور بات کہ برسا نہیں ہے ابرِ کرم
ہوائے سرد سے پھولوں کو تازگی تو ملی

تمہارے عکس کو آنکھوں میں بھر لیا میں نے
میرے خیال کے ساگر کو جل پری تو ملی

تھکن سے چور بدن کب تلک اٹھاتا میں
خدا کا شکر ہے آخری تری گلی تو ملی

یہ عشق چاٹ گیا ہے مرا بدن لیکن
کہ میری سوچ کے پنچھی کو آگہی تو ملی

کسی کا لمس تھا یا پھر صدائے 'کن' ارشدؔ
چلو یوں خاک کے پتلے کو زندگی تو ملی

ㅇ

وہیں تک دیکھتا ہوں میں نظر میری جہاں تک ہے
خبر کیا بے کراں ساگر ترا ساحل کہاں تک ہے

نجانے کب تصور سے حقیقت میں بدل جائے
کسی کا چاند چہرہ جو ابھی وہم و گماں تک ہے

عدو نے من گھڑت باتیں سبھی بے پر اڑائی ہیں
حقیقت اس کہانی کی فقط اک رازداں تک ہے

ادھر آ میں بتاتا ہوں تخیل کس کو کہتے ہیں
اڈاری اس پرندے کی زمیں سے آسماں تک ہے

محبت کے کرشمے سے ہوئے تخلیق دو عالم
اسی کی سب عطا ہے جو مکاں سے لامکاں تک ہے

پھر اس کے بعد سب اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے
تری چوپال کی رونق ہماری داستاں تک ہے

یقیناً کچھ نہ کچھ اس کو تسلی ہو ہی جائے گی
دلِ مضطر کی ساری اضطرابی امتحاں تک ہے

اب ارشدؔ ضبط کا بند ٹوٹنے کا خوف رہتا ہے
مری آنکھوں کا پانی بھی تو خطرے کے نشاں تک ہے



ہونٹ کچھ بھی نہ دیں صفائی، بھائی
آنکھ کرتی ہے لب کشائی، بھائی

کیوں تلے ہو ملانے مٹی میں
لاج پرکھوں نے تھی کمائی بھائی

تم تو اندھے کنویں میں ڈال گئے
اور میں دیتا رہا دہائی بھائی

کوئی سازش رچا کے آئے ہو
آنکھ مجھ سے نہیں ملائی بھائی

اب پڑوسی ہیں ایک دوجے کے
کل جو رہتے تھے مل کے بھائی بھائی

اشک بن کے لہو ٹپکتا ہے
چوٹ ارشد وہ دل پہ کھائی، بھائی

○

بساطِ زیست

کہیں تو پھینک ہی دیں گے یہ بار سانسوں کا
اُٹھائے بوجھ جو پھرتے ہیں یار سانسوں کا

انا، غرور، تکبر، حیات کچھ بھی نہیں
کہ سارا کھیل ہے پیارے یہ چار سانسوں کا

چلو یہ زندگی زندہ دلی سے جیتے ہیں
بڑھے گا اس طرح کچھ تو وقار سانسوں کا

گلابی ہونٹ وہ ہونٹوں پہ رکھ کے کہتی تھی
رہے گا عمر بھر تجھ پہ خمار سانسوں کا

بڑے قریب سے گزری ہے موت چھو کے تجھے
جو ہو سکے کوئی صدقہ اُتار سانسوں کا

ہوا یہ وجد میں آ کر دیے سے کہنے لگی
کہ اب تو سہہ نہیں پائے گا وار سانسوں کا

اسے ہم زندگی سمجھیں تو کس طرح ارشدؔ
کسی کے ہاتھ میں ہے اختیار سانسوں کا



شاخِ مشرق سے جو اُگا سورج
اب مرے سر پہ ہے کھڑا سورج

قصرِ دل کو اجالنے کے لیے
کاش اک بار جھانکتا سورج

اب تو آنکھوں میں دھند اترنے لگی
ہو نگاہِ کرم ذرا سورج

سب کے سب ہیں مرے قبیلے کے
چاند، جگنو، ہوا، دیا سورج

خود اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے
ان اجالوں کو بانٹتا سورج

وقت مغرب کا ہو گیا ارشدؔ
وہ سمندر میں جا گرا سورج



پربت سے جو اُترا بادل
صحرا صحرا بھٹکا بادل

تیری یاد کا ساون آیا
میری آنکھ سے برسا بادل

بنجر دل پر کب برسے گا
تیرے پیار کا بھیگا بادل

آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو برسے
جب قرطاس پہ لکھا بادل

صحراؤں میں پیاس اُگی ہے
کیسا دریا کیسا بادل

جانے کس کھلیان پہ برسے
سج دھج کر ہے نکلا بادل

دیکھ کے ارشدؔ کھو جاتا ہوں
پربت، ساگر، صحرا، بادل



اس لیے بھی دوستوں سے میں خفا ہوتا نہیں
ہر کسی کا ہر کسی سے حق ادا ہوتا نہیں

اب میسر کیا تمہیں آؤں گا میں اس شہر میں
آج کل تو خود سے میرا رابطہ ہوتا نہیں

کوئی مسجد ہو کلیسا ہو یا کوئی بت کدہ
ہر جگہ موجود ہے یا پھر خدا ہوتا نہیں

اس زمیں کو چھوڑ کر چاہے چلا جا چاند پر
آسماں سر پہ رہے گا زیرِ پا ہوتا نہیں

عشق ہستی کو نگل جاتا ہے ارشدؔ سوچنا
اس گھنے جنگل میں کوئی راستہ ہوتا نہیں

○

لڑکی باتیں کرتی ہے
اچھی باتیں کرتی ہے

وہ تو دھیمے لہجے میں
میٹھی باتیں کرتی ہے

جیسا سندر چہرہ ہے
ویسی باتیں کرتی ہے

ہم دونوں جب ملتے ہیں
چُنری باتیں کرتی ہے

اس کے کان کی بالی بھی
میری باتیں کرتی ہے

دنیا کی تو عادت ہے
جھوٹی باتیں کرتی ہے

ارشدؔ کیا وہ سکھیوں سے
ساری باتیں کرتی ہے



ایسے الجھی ہے ڈور سوچوں کی
نیند اڑنے لگی ہے آنکھوں کی

دل کے جنگل میں رقص کرتی ہیں
کئی چڑیلیں تمہاری یادوں کی

مجھ کو حکم اذاں ملا ہے وہاں
جو کہ بستی ہے بہرے لوگوں کی

اس نے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھے تھے
خوشبو جاتی نہیں ہے سانسوں کی

دل نے برسوں عذاب جھیلے ہیں
ہم نے کی تھیں خطائیں لمحوں کی

دشت آنکھوں میں بھر لیا ارشدؔ
یہ نشانی تھی میرے پرکھوں کی



کچھ یوں ترے مدار سے نکلا ہوں اب کی بار
میں اپنے اختیار سے نکلا ہوں اب کی بار

قصرِ نمود ذات سے باہر نکل کے آ
میں بھی انا کے غار سے نکلا ہوں اب کی بار

منزل کے خدوخال ہیں آنکھوں کے سامنے
صحرا ترے غبار سے نکلا ہوں اب کی بار

شاید کبھی سکون کی سانسیں نصیب ہوں
یادوں کے اک حصار سے نکلا ہوں اب کی بار

یہ کیا کہ تم نے مجھ سے عداوت بھی چھوڑ دی
تو کیا ترے شمار سے نکلا ہوں اب کی بار

مقتل میں کوئی مانگ رہا ہے مبارزت
سج دھج کے اِک وقار سے نکلا ہوں اب کی بار

ارشدؔ ردائے عشق کو سر سے اتار کر
اس دشتِ خار زار سے نکلا ہوں اب کی بار



کھا جائے میرے غم وہ بلا مانگ رہا ہوں
رو رو کے الٰہی میں دعا مانگ رہا ہوں

لکھی ہے مقدر میں ضرورت بھی انوکھی
اس واسطے اوروں سے جدا مانگ رہا ہوں

تک تک مجھے دیکھے ہے مرا چاہنے والا
اتنا بھی نہ سمجھے کہ میں کیا مانگ رہا ہوں

بس میں نے تو چاہا تھا کبھی ربط نہ ٹوٹے
کب تم سے وفاؤں کا صلہ مانگ رہا ہوں

کس واسطے دنیا مرے کاسے میں گرا دی
درویش ہوں میں اس کے سوا مانگ رہا ہوں

اس تیرہ شبی سے کوئی سورج کو نکالے
ارشد میں اندھیروں سے ضیا مانگ رہا ہوں



حبس اِدھر، اُس پار ہوا
بھیج خدا نمدار ہوا

دیواروں کے دیپ بجھے
بپھری تھی اس بار ہوا

صحرا صحرا بانٹتی ہے
پھولوں کی مہکار ہوا

برف بدن کو چھو آئی
جون میں ٹھنڈی ٹھار ہوا

پھولوں کو رعنائی دیں
تتلی بلبل ، خار ہوا

شاخوں سے یوں دور کھڑی
لگتی ہے بے زار ہوا

ارشدؔ جینے کا ساماں
قدرت کا شہکار ہوا



جمالِ یار اگر بدگماں نہیں ہوتا
ذرا سا فاصلہ بھی درمیاں نہیں ہوتا

صدائیں آج بھی دیتا ہوں دل کے گنبد میں
میں جانتا ہوں کہ وہ اب یہاں نہیں ہوتا

تمہیں اے کاش کبھی ہمسفر نہیں کرتے
ہمارے زیست کا بھی یوں زیاں نہیں ہوتا

تمام رات وہ آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں
کہ جن کے سر پہ کوئی سائباں نہیں ہوتا

کسی کسی کو مقدر اجال دیتا ہے
ہر ایک نام یہاں جاوداں نہیں ہوتا

جدائی چاٹتی رہتی ہے جسم و جاں ارشدؔ
یہ ایسی آگ ہے جس کا دھواں نہیں ہوتا



ہوا چاہت کا نغمہ گا رہی تھی
دیے کی لو سمٹتی جا رہی تھی

میں ارمانوں کا ماتم کر رہا تھا
کوئی دلہن بنی شرما رہی تھی

فسانہ پھر ادھورا رہ گیا تھا
کہانی وقت کو دہرا رہی تھی

کلی کرنوں کی حدت سے چٹخ کر
گلستاں کی فضا مہکا رہی تھی

کوئی مہتاب پانی میں گرا تھا
ندی کس بات پر اترا رہی تھی

پرندے گھونسلوں میں جا چکے تھے
اکیلی کونج ہی کرلا رہی تھی



چمکی یوں سرخ دھوپ کہ نقشہ بدل گیا
پل بھر میں ایک پیڑ کا سایہ بدل گیا

میں تم سے کہہ رہا تھا وہ گرگٹ مزاج ہے
روتے ہو کس لیے کوئی چہرہ بدل گیا

کافور کس طرح ہوئی باتوں سے چاشنی
مطلب نکلتے ہی ترا لہجہ بدل گیا

اس بھُربھُری زمین پہ دریا کو زعم تھا
صحرا کے پاس آ کے وہ رستہ بدل گیا

تیرے لیے جو کل تھا وہی آج بھی ہوں میں
تو مانتا نہیں ہے تو اچھا بدل گیا

اس نے مری غزل بھی یوں رکھی بیاض میں
ہر شعر جوں کا توں رہا مقطع بدل گیا

محروم ہو چکے ہیں جو شیشم کی چھاؤں سے
ارشد ہمارا گاؤں بھی کتنا بدل گیا



شبِ سیاہ میں یوں حوصلہ بڑھاتا ہوا
کسی خیال کا جگنو ہے جگمگاتا ہوا

نجانے کونسا لمحہ سپردِ خاک کرے
میں ایک اشک ہوں پلکوں پہ جھلملاتا ہوا

کنارا لاکھ ہو آنکھوں کے سامنے لیکن
سفینہ ڈوب بھی سکتا ہے ڈگمگاتا ہوا

خدایا اس کے لبوں کی ہنسی سلامت ہو
جو میرے پاس سے گزرا ہے مسکراتا ہوا

بدن کی بھربھری مٹی کو دھول کر بیٹھا
کسی کے واسطے میں راستہ بناتا ہوا

ذرا سی دیر میں بے حال ہوگیا ارشدؔ
پرندہ جال کے ہاتھوں میں کسمساتا ہوا

○

جب تلک سانس کا تسلسل ہے
تو مری خواہشوں میں شامل ہے

کشتیِ جاں بھنور میں ہے مانا
تو مری آرزو کا ساحل ہے

حبس ایسا ہے دل کے آنگن میں
سانس لینا بھی اب تو مشکل ہے

سبز آنکھوں سے وار کرتا ہے
ایسا خوبرو وہ قاتل ہے

اک نشانی ہے اور بھی اس کی
سرخ ہونٹوں کے نیچے اک تل ہے

میرے سینے میں پھڑپھڑاتا ہوا
دل کا پنچھی بہت ہی گھائل ہے

کچھ کتابوں پہ نام ارشدؔ کا
یہ مری زندگی کا حاصل ہے

○

دل مرا اس لیے بھی بوجھل ہے
ایک منظر نظر سے اوجھل ہے

آج بھی ہونٹ مثلِ صحرا ہیں
آج بھی آنکھ میری جل تھل ہے

لوگ رستہ بھٹک ہی جاتے ہیں
یہ محبت بھی ایک جنگل ہے

جس نے مجھ کو چرا لیا مجھ سے
ایک لڑکی بہت ہی چنچل ہے

اور تو کچھ نہیں کہانی میں
اک حویلی ہے اور مقفل ہے

کوئی جنت چرانے آیا تھا
اس لیے شہر بھر میں ہلچل ہے

یار ارشدؔ تو دھیان میں رکھنا
یہ جو دُنیا ہے ایک دلدل ہے



دل میں پالا ہے یوں تمہارا دکھ
جیسے جینے کا ہو سہارا دکھ

اک کنارا ہے سکھ محبت کا
اور ہے دوسرا کنارا دکھ

میں نے مانگی کتاب چاہت کی
اس نے بھیجا ہے اک شمارہ دکھ

تم محبت کی بات کرتے ہو
تم سے ہوگا نہیں گوارا دکھ

پتی پتی گلوں کی روتی ہے
کس نے گلشن میں ہے اتارا دکھ

دشت دامن میں بھر لیا ارشدؔ
ایک جیسا تھا بس ہمارا دکھ



تجھ پہ گزری تھی غم کی رات بھی کیا
چاند رویا تھا تیرے ساتھ بھی کیا

تم پہ جیون تو ہار بیٹھا ہوں
اور ہوتی ہے کوئی مات بھی کیا

میرا سایہ تو مجھ کو چھوڑ گیا
چھوڑ دے گا غمِ حیات بھی کیا

وہ جو لایا ہے چشم دید گواہ
اس نے دیکھی تھی واردات بھی کیا

سر کی جنبش کو چھوڑیئے صاحب
آپ سمجھے ہیں میری بات بھی کیا

اس کے گیسو سلجھ گئے ارشدؔ
اور سلجھے معملات بھی کیا



جونہی لپٹی ہوا چراغوں سے
روٹھ بیٹھی ضیا چراغوں سے

ایک اُجڑا ہوا مکان ہوں میں
مجھ کو یوں نہ سجا چراغوں سے

کوئی جھونکا بجھا بھی سکتا ہے
آس رکھوں بھی کیا چراغوں سے

روشنی مجھ سے ہمکلام ہوئی
عکس ابھرا ترا چراغوں سے

عشق ہستی کو پھونک دیتا ہے
آ رہی تھی ندا چراغوں سے

ٹمٹماتے ہیں تب دیے ارشد
کھیلتی ہے ہوا چراغوں سے



پیچھا کرتے کرتے اِک آوازے کا
شب نے سینہ چاک کیا دروازے کا

دور اُفق پر ایسے لالی پھیل گئی
جیسے رخ پہ لیپ کیا ہو غازے کا

کوزہ گر نے پہلے کیا تخلیق کیا
سارا کھیل تماشا ہے اندازے کا

اجڑی ایک حویلی رو رو کہتی ہے
کون ہے وارث بکھرے اس شیرازے کا

آگ سے کھیلنے والے ہاتھوں کو ارشدؔ
سامنا کرنا پڑتا ہے خمیازے کا

O

میں جس کے واسطے خود آج دوستوں میں نہیں
وہ ایک شخص بھی کچھ دن سے رابطوں میں نہیں

تو سرسرا کے چلے یا کہ دندنائے ہوا
کوئی چراغ مرے گھر کے طاقچوں میں نہیں

عجیب سانحہ گزرا ہے شب کے پچھلے پہر
شجر اداس ہیں پنچھی بھی گھونسلوں میں نہیں

جدھر نگاہ کروں ریت ہے یا گرد و غبار
کہ سنگ میل بھی صحرا کے راستوں میں نہیں

حنائی ہاتھ کی دستک ہے یا ہوا کا گزر
تمہارے لمس کی خوشبو تو آہٹوں میں نہیں

وہ مری لاش پہ آئے ہیں سر جھکائے ہوئے
کہ مرے یار بھی شامل تو قاتلوں میں نہیں

بس اب تو شوق ہی اڑنے کا رہ گیا ارشدؔ
ذرا سی جان بھی ٹوٹے ہوئے پروں میں نہیں



دھوپ سے لڑتا مسافر معتبر ہونے لگا
ابر کا ٹکڑا جب اس کا ہمسفر ہونے لگا

صحن گلشن میں خزاؤں کا اثر ہونے لگا
رفتہ رفتہ بے لبادہ ہر شجر ہونے لگا

اک تری تصویر رکھی تھی سجا کر میز پر
اس تغیر سے مکاں میرا یہ گھر ہونے لگا

دھیرے دھیرے داستاں کی کھل گئیں گرہیں سبھی
آگ ٹھنڈی پڑتے قصہ مختصر ہونے لگا

دل کی بستی کے اجڑنے کی کہانی جب سنی
آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر بہ تر ہونے لگا

رفتہ رفتہ سب رگوں میں سنسناہٹ آ گئی
نفرتوں کے زہر کا ایسا اثر ہونے لگا

چلچلاتی دھوپ بھی تھی آبلہ پائی بھی تھی
اب تمہارا غم بھی میرا ہمسفر ہونے لگا

جب سمجھ آنے لگی مجھ کو پرندوں کی زباں
معترف میری ریاضت کا شجر ہونے لگا

سوچتا ہوں اس پہ ارشدؔ اب بھروسہ کیا کروں
کرکے جو رسوا مجھے خود معتبر ہونے لگا



چاہت میں کوئی ضابطہ رکھا نہیں کبھی
سود و زیاں کا ہم نے تو سوچا نہیں کبھی

ملتی نہیں ہے جیت کی بھی چاشنی اسے
جو کہ بساطِ عشق پہ ہارا نہیں کبھی

جس میں تمہارے روپ کا پرتو دکھائی دے
چہرہ ہماری آنکھ نے دیکھا نہیں کبھی

پھیلا ہے تیری آنکھ میں کاجل یہ کس لیے
تو بے سبب تو آج تک رویا نہیں کبھی

بساطِ زیست

جو آدمی کے درد کو محسوس نہ کریں
ان پتھروں کو ہم نے تو پوجا نہیں کبھی

اڑ جائے تیرا روپ نہ تپتی نگاہ سے
جی بھر کے تجھ کو اس لیے دیکھا نہیں کبھی

وہ کیا بھلا مٹائے گا تشنہ لبی مری
چاہت کی ایک بوند جو دیتا نہیں کبھی

خوشیاں ہزار آئیں گی ہر ایک موڑ پر
بچپن کا دور لوٹ کے آتا نہیں کبھی

اٹکھیلیاں تو کرتا ہے دشت خیال میں
آہو ہماری سوچ کا بھٹکا نہیں کبھی

بن کے حوالہ جو مرے کتبے پہ درج ہو
ایسا تو ایک شعر بھی اترا نہیں کبھی

اک دن اسی مقام پر آئیں گے وہ ضرور
ارشد نے جانے والوں کو روکا نہیں کبھی



ایک بجھتا ہوا دیا ہوں میں
آخری سانس پر کھڑا ہوں میں

غم اٹھا کے بھی مسکراتا ہوں
کونسی خاک سے بنا ہوں میں

تو جہاں پھینک کر گیا تھا مجھے
دیکھ اب بھی وہیں پڑا ہوں میں

روز مجھ کو اچھال دیتی ہیں
روز آنکھوں میں ڈوبتا ہوں میں

اب جو چاہے سلوک کر مجھ سے
تیرے در پہ جو آ گیا ہوں میں

اپنی میت اٹھائے پھرتا ہوں
ایک مدت سے مر چکا ہوں میں

بات کرنا ذرا سلیقے سے
تیرے قد سے میاں بڑا ہوں میں

رعب مجھ پہ نہ ڈال باتوں کا
تیرے جیسا ہی سر پھرا ہوں میں

جس کو دل میں چھپائے بیٹھے ہو
اس حقیقت کو جانتا ہوں میں

تم سے ہوتی ہے گفتگو اکثر
آئنہ جب بھی دیکھتا ہوں میں

جب سے تم نے نگاہ بدلی ہے
بس اسی دن سے لاپتہ ہوں میں

پھر زباں سے ادا وہ ہوتے ہیں
پہلے لفظوں کو تولتا ہوں میں

عشق ہستی اجاڑ دیتا ہے
اس کے نرغے میں آ گیا ہوں میں

اتنا سوچا ہے روز و شب تم کو
ہو بہو تجھ سا ہو گیا ہوں میں

یہ جو سانسوں کے تار بجتے ہیں
ایک وعدہ نبھا رہا ہوں میں

پیار اتنا کیا ہے مٹی سے
خاک میں خاک ہو گیا ہوں میں

اب صدائیں مجھے نہ دو یارم
تیری دنیا سے جا چکا ہوں میں

خواب پلکوں پہ رقص کرتے ہیں
ایک مدت سے جاگتا ہوں میں

وہ کیوں راہیں بدل گیا ارشد
اک یہی بات سوچتا ہوں میں

بساطِ زیست

○

ترے آزار مرتے جا رہے ہیں
مرے اشعار مرتے جا رہے ہیں

خوشی ناپید ہوتی جا رہی ہے
کہ اب تہوار مرتے جا رہے ہیں

خزائیں بال کھولے ناچتی ہیں
گل و گلزار مرتے جا رہے ہیں

کہانی کس طرف کو چل پڑی ہے
سبھی کردار مرتے جا رہے ہیں

حویلی دل کی ویراں ہو گئی ہے
در و دیوار مرتے جا رہے ہیں

مجھے مر مر کے جینا پڑ رہا ہے
مرے غمخوار مرتے جا رہے ہیں

بہت ارزاں ہوئی ہے آدمیت
کہ اب معیار مرتے جا رہے ہیں

ہم اپنی ذات کے زنداں میں ارشدؔ
پسِ دیوار مرتے جا رہے ہیں



کالی زلف کا لوہا منوا سکتی ہو
میری سوچ کے سورج پہ چھا سکتی ہو

دیکھو ! تیور بدل رہا ہے موسم کا
تم چاہو تو چھتری میں آ سکتی ہو

سچ مچ کوئل جیسا میٹھا لہجہ ہے
کیا تم میری کچھ غزلیں گا سکتی ہو

انٹرول سے آگے اصل کہانی ہے
اٹھ کے جانا چاہو تو جا سکتی ہو

بھولی بھالی صورت سے یوں لگتا ہے
چکنی چپڑی باتوں میں آ سکتی ہو

تشنہ آنکھوں کی ایسے کچھ پیاس بجھے
ایسا کوئی منظر دکھلا سکتی ہو

ارشدؔ سب کچھ ہار کے اب وہ روتی ہے
لاکھ کہا تھا دھوکا بھی کھا سکتی ہو



ایسا بھی کیا دیکھ رہی ہو
آنکھ میں چہرہ دیکھ رہی ہو

کیمپس کی سیڑھی پر بیٹھی
کس کا رستہ دیکھ رہی ہو؟

یعنی آنکھیں میچے لڑکی
پھر اک سپنا دیکھ رہی ہو؟

اتنی سندر دُنیا کب تھی
اس کو جیسا دیکھ رہی ہو

یہ سب تیرے بعد ہوا ہے
گھر کا کچرا دیکھ رہی ہو

میں بھی کیا کیا سوچ رہا ہوں
تم بھی کیا کیا دیکھ رہی ہو

ہار کے ارشدؔ جیت گیا ہے
کھیل انوکھا دیکھ رہی ہو



میلی قسمت دھو سکتی ہو
کیا تم میری ہو سکتی ہو

بھیڑ میں انگلی تھام کے رکھنا
بھولی لڑکی کھو سکتی ہو

یعنی تجھ کو پیار ہے مجھ سے
بکھرے خواب پرو سکتی ہو

میں اِک مصرع سوچ رہا ہوں
تم چاہو تو سو سکتی ہو

تیرے نام کا زہر پیا ہے
باہیں کھول کے رو سکتی ہو

پھولوں جیسی صورت والی
دل میں خار چبھو سکتی ہو

ارشدؔ اس نے تیر ہیں توڑے
کہہ دو! پیار ڈبو سکتی ہو



سنو! غیر ممکن ہمارا ملن ہے
میں اک خاک زادہ تو بنت گگن ہے

تمہیں دیکھ کر میں یوں حیرت میں گم ہوں
کمال اس کا جس نے تراشا بدن ہے

ارے تم تو چھونے سے کملا رہی ہو
"عجب ہے نزاکت، غضب بانکپن ہے"

اسے چھو کے آتی نہیں اب ہوائیں
تبھی تو فضاؤں میں ایسی گھٹن ہے

جسے میں سمجھنے سے قاصر رہا ہوں
کہوں کیا میں کیسا وہ طرزِ سخن ہے

مجھے گر وہ تعظیم دیتا ہے ارشدؔ
زمانے کے دل میں کیوں ہوتی چبھن ہے



ہر ایک موسم میں لہلہانے کی ٹھان لی ہے
گلوں نے صَرصَر کا دل جلانے کی ٹھان لی ہے

نکال کر ہم رہیں گے کشتی کو اس بھنور سے
کہ زورِ بازو کو آزمانے کی ٹھان لی ہے

تُو دیکھنا ہم غرور توڑیں گے رنج و غم کا
ہمارے ہونٹوں نے مسکرانے کی ٹھان لی ہے

میں ایک مدت سے چاک پر یوں پڑا ہوا ہوں
وجودِ ہستی کو کیا بنانے کی ٹھان لی ہے

کوئی بھی ایسا نہیں جو سمجھے مزاج میرا
تمہاری بستی سے لوٹ جانے کی ٹھان لی ہے

بھروں گا صحرا کو آنسوؤں سے کہ عکس اترے
یوں آسماں کو زمیں پہ لانے کی ٹھان لی ہے

یہاں سے وحشت کو کوچ کرنا پڑے گا ارشدؔ
کہ فاختاؤں نے چہچہانے کی ٹھان لی ہے



مانتے ہیں ہوئی خطا صاحب
تم کو سمجھا تھا ناخدا صاحب

بیچ منجدھار چھوڑ دی کشتی
تم نے اچھا نہیں کیا صاحب

خواب پہلے دکھائے آنکھوں کو
توڑ ڈالا پھر حوصلہ صاحب

ایک بس آپ کے بدلنے سے
سارا منظر بدل گیا صاحب

قتل کرنے لگی چراغوں کو
آج ایسی چلی ہوا صاحب

کس طرح بے خبر ہو بندوں سے
ایسا ہوتا نہیں خدا، صاحب

آؤ ارشد کہیں مسیحا سے
یہ مرض لا دوا ہوا صاحب

○

بجائے دھوپ سے ایسا بنا رہا ہوں میں
گھنے درخت کا سایہ بنا رہا ہوں میں

کنارے جھیل کے یونہی نہیں ہوں بیٹھا ہوا
شفاف آب پہ چہرہ بنا رہا ہوں میں

دکھائی دے تو رہی ہے یہ آبلہ پائی
کسی کے واسطے رستہ بنا رہا ہوں میں

سخنوری کروں تجھ کو نکھارنے کے لیے
تُو ایسا ہے نہیں، جیسا بنا رہا ہوں میں

تمہارے ہجر کی صدیاں کشید کرتے ہوئے
بس اک وصال کا لمحہ بنا رہا ہوں میں

اے مرے مالک و مولا مراد بھر دے مری
لے اپنے ہاتھ کا کاسہ بنا رہا ہوں میں

تمہاری یاد کے لعل و گہر پرونے کو
کپاس کات کے دھاگہ بنا رہا ہوں میں

جو میری ذات سے ارشدؔ گریز کرتا رہا
اُسی کو آنکھ کا تارا بنا رہا ہوں میں

○

تمہاری جیت کا معیار نہیں مانتا میں
بساطِ زیست پہ یوں ہار نہیں مانتا میں

جسے دکھائی بھی دیتے نہیں ہیں غم میرے
اک ایسے شخص کو غم خوار نہیں مانتا میں

یہاں تو خوف کے سائے میں شب گزرتی ہے
خوشی کے دن کو بھی تہوار نہیں مانتا میں

تمہاری آنکھ میں دنیا کی جھلملاہٹ ہے
تمہیں اس عشق کا بیمار نہیں مانتا میں

وہ جب زبان پر اپنی نہیں رہا قائم
اسے تو صاحبِ کردار نہیں مانتا میں

مجھے دلیل سے قائل تو کر بھی سکتا ہے
اگر مگر کی یہ تکرار نہیں مانتا میں

بس ایک دھن میں چلا جا رہا ہوں میں ارشدؔ
کسی کو راہ کی دیوار نہیں مانتا میں



خدا کے نام کی توہین نہیں کر سکتا
میں اپنے آپ کو بے دین نہیں کر سکتا

کہو تو بیٹھ کے الجھن کا حل نکالتے ہیں
ادھوری بات پہ آمین نہیں کر سکتا

کرائے دار کے ایسے نصیب ہوتے ہیں
وہ گھر کی چاہے بھی تزئین نہیں کر سکتا

اک ایسے اشک کو بے فائدہ سمجھتا ہوں
حلق ہمارا جو نمکین نہیں کر سکتا

جو خواب آنکھ کے ساحل پہ مر گئے ان کی
حدودِ ذات میں تدفین نہیں کر سکتا

کروں گا الوداع اس کو چھلکتی آنکھوں سے
اسے میں رکنے کی تلقین نہیں کر سکتا

چراغِ شام جلانے سے فائدہ ارشدؔ
اگر وہ رات کو رنگین نہیں کر سکتا



تو کبریا کے فرامین کو کیا سمجھے گا
کہ دہریا ہے مرے دین کو کیا سمجھے گا

ابھی تو عشق کی ابجد سے آشنا بھی نہیں
نصابِ ہجر کی تدوین کو کیا سمجھے گا

وہ جس کے دل میں کوئی جل پری نہیں اتری
وہ قصرِ ذات کی تزئین کو کیا سمجھے گا

خدا کی ذات کو خاطر میں جو نہیں لاتا
ہمارے جیسے وہ مسکین کو کیا سمجھے گا

حیاتِ بزمِ طرب میں نہیں کٹی جس کی
وہ شخص روح کی تسکین کو کیا سمجھے گا

اٹھائے پھرتا ہے کشکول جو کہ شام و سحر
انا پرستی کی توہین کو کیا سمجھے گا

اسی کے حال پہ اب چھوڑ دے اسے ارشدؔ
وہ خود پرست ہے تلقین کو کیا سمجھے گا



○

اشک پلکوں پہ سجاؤں گا چلا جاؤں گا
میں ترا ہجر مناؤں گا چلا جاؤں گا

بزمِ یاراں میں ذرا دیر گوارا کر لو
آخری گیت سناؤں گا چلا جاؤں گا

سرخ ہونٹوں سے نہیں پیاس بجھانی لڑکی!
ایک مصرع میں اٹھاؤں گا چلا جاؤں گا

میں نے منہ زور خزاؤں سے بغاوت کی ہے
"پھول گلشن میں کھلاؤں گا چلا جاؤں گا"

مجھ کو اک تیری طلب لے کے زمیں پر آئی
میں ترا پیار کماؤں گا چلا جاؤں گا

کون سنتا ہے یہاں دل کی دہائی ارشدؔ
یونہی بس شور مچاؤں گا چلا جاؤں گا

○

بنا کے اس لیے رکھنا پڑے گی جیون سے
ہزار خواہشیں لپٹی ہوئی ہیں دامن سے

تمہارے بعد یہ دنیا تیاگ دی میں نے
نباہ کس طرح کرتا تمہاری سوتن سے

کسی فصیل کی سازش بھی اس میں شامل ہے
گریز پا جو ہوئی دھوپ میرے آنگن سے

مجھے بھی طور کی صورت جلا دیا اس نے
اِک ایسے نور نے جھانکا تھا مجھ کو چلمن سے

صفائی ہاتھ کی تم کو دکھانے والا ہوں
میں ایک پھول نکالوں گا خالی برتن سے

یہ کارِ عشق ہے اس میں کفایتیں کیسی
جسے بھی چاہتے ہیں چاہتے ہیں تن من سے

رہے گا خود بھی سدا اضطراب میں ارشدؔ
نکال کر وہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن سے

ملی نغمہ

کچھ دن یونہی گھر کی چھت پہ جھنڈے بھی لہراؤ گے
دکھلاوے کا پیار وطن سے تم سب ہی دکھلاؤ گے

آج تو جشنِ آزادی ہے سارے پاکستانی ہو
بس اک دن کی بات ہے کل سے قوموں میں بٹ جاؤ گے

پاکستان کا مطلب کیا ہے محشر میں گر پوچھا تو
لا الٰہ الا اللہ تم کہتے بھی شرماؤ گے

چور لٹیرو کب سوچا تھا ایسا وقت بھی آئے گا
قائد کا یہ تحفہ مثلِ دیمک تم کھا جاؤ گے

منزل پانے کی خاطر کچھ محنت کرنی پڑتی ہے
ماضی کی یادوں سے یونہی کب تک دل بہلاؤ گے

یہ میرا ایمان ہے اک طوق گلے کا ٹوٹے گا
نازک شانوں پر اے ظالم کتنا بوجھ بڑھاؤ گے

پیار وطن سے ہے تو ارشدؔ آؤ مجھ سے عہد کرو
اس دھرتی کے ہر دشمن کی آنکھ سے آنکھ ملاؤ گے

ملی نغمہ

پاک وطن تو پرکھوں کا سرمایا ہے
ہم نے تو ورثے میں سب کچھ پایا ہے

پہلے کتنے آنچل وارے بہنوں نے
سبز ہلالی پرچم تب لہرایا ہے

اس جھنڈے کی چھاؤں میں یوں لگتا ہے
اللہ کی رحمت کا سر پہ سایا ہے

ایسی قسمت لے کے جگ میں آئے ہیں
دنیا میں فردوس کا ٹکڑا پایا ہے

انیس سو سنتالیس میں جو پھول کھلا
اس نے سارے عالم کو مہکایا ہے

پاک وطن تو نغمہ میری سانسوں کا
دھڑکن کی ہر لے پہ تجھ گایا ہے

خاکِ وطن ہے ارشدؔ سرمہ آنکھوں کا
نور نظر کا جس نے اور بڑھایا ہے

تمہارے جنم دن پر......

زندگی ہے تری اک حسیں موڑ پر
پھر گرہ پڑ گئی عمر کی ڈور پر

پر مسرت گھڑی تم کو حاصل ہوئی
سال چوبیں سے پچیس میں داخل ہوئی

پھول خوشیوں کے ہر پل مہکتے رہیں
تیرے ہونٹوں کے پنچھی چہکتے رہیں

کشتِ دل یوں سدا لہلہاتی رہے
اے مری جان تو مسکراتی رہے

چھو نہ پائے تجھے غم کی تپتی ہوا
ماں کا آنچل کرے سر پہ سایہ سدا

ایسے اپنے گھرانے کی دمساز ہو
تیرے بابا کو تجھ پہ سدا ناز ہو

میرے دل سے یہ اُٹھنے لگی ہے دعا
ہر قدم تیرا حامی و ناصر خدا

مل کے ہم نے گزاری ہیں جو ساعتیں
یاد رکھیں گی ان کو مری دھڑکنیں

مجھ کو ارشدؔ یہ کہنے میں کیا عار ہے
تو مرا دوست ہے میرا غم خوار ہے



عورت

بنایا ہے مصور نے حسیں شہکار عورت کو
الگ پہچان دیتا ہے کہانی کار عورت کو

وہ ماں ہو، بہن، بیوی، یا کہ بیٹی ہو سنو لوگو
ہر اک کردار میں رکھا گیا غم خوار عورت کو

یہی سچ مچ بنا دے گی ترے گھر کو حسیں جنت
ذرا تم پیار سے کرنا کبھی سرشار عورت کو

پھر اک دن ان کی قسمت میں لکھی جاتی ہے رسوائی
زمانے میں سمجھتے ہیں جو کاروبار عورت کو

اسی کا روپ دھارے پھر رہی ہیں کچھ چڑیلیں بھی
میں عورت ہی نہیں کہتا کسی مکار عورت کو

سلام ان عورتوں پر جو کہ مائیں ہیں شہیدوں کی
سلامی پیش کرتا ہوں میں سو سو بار عورت کو

مجھے اس وقت ارشدؔ کیوں مری ماں یاد آتی ہے
کسی کٹیا میں دیکھوں جب کسی نادار عورت کو

تمہیں آزاد کرتا ہوں

محبت کے سبھی وعدے
سبھی قسمیں سبھی رسمیں
جنہیں مل کر نبھانے کے
کیے عہد و پیماں ہم نے
تمہیں اب بار لگتے ہیں
جو بندھن توڑنا چاہو
مجھے گر چھوڑنا چاہو
ستم یہ بھی میں سہہ لوں گا
تمہارے بن میں رہ لوں گا
کہ دل ناشاد کرتا ہوں
تمہیں آزاد کرتا ہوں



ابنِ آدم

کوئی جب پوچھتا ہے یہ
شیعہ ہو تم یا سنی ہو
وہابی ہو کہ دیوبندی
بتاؤ کونسے فرقے سے نسبت ہے
نجانے کیوں مجھے اک پل
سجھائی کچھ نہیں دیتا
میں گہری سوچ میں تب ڈوب جاتا ہوں
مرے اندر سے اک آواز آتی ہے
سنا ہے تم نے بچپن سے

کہ تم تو ابن آدم ہو
تو پھر سچ سچ بتاؤ نا
مسلمانوں کے فرقے کیا
یہ ہندو، سکھ، نصاریٰ، پارسی تک بھی
جہاں میں جتنے انساں ہیں
مرے بابا کے بیٹے ہیں
یہ مانا شکل و صورت میں
ذرا سے مختلف ہوں گے
رگوں میں دوڑتا ہے جو
لہو تو ایک جیسا ہے
سبھی اولادِ آدم سے
کہ جس میں آدمیت ہو
مری تو اس سے نسبت ہے
اُسی سے خون کا رشتہ
یہی سچ ہے
کہ جب میں ابنِ آدم ہوں
مرا مذہب وہی ہے جو
مرے بابا کا مذہب تھا



عقدہ

مرے مولا
مرے مالک
یہی سچ ہے
تو خالق سب جہانوں کا
سبھی مخلوق تیری ہے
کہ لفظِ کُن سے چلتا ہے
نظامِ سلطنت تیرا
رضا تیری نہ ہو جب تک
پرندہ پَر نہیں مارے
مرے مولا
تُو عادل ہے
ہمیشہ عدل کرتا ہے
مگر میں یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہوں
کہیں جب قتل ہوتے ہیں
تمہارے بے گناہ بندے
تو کس کا زور چلتا ہے



قیدی

سنو لڑکی
محبت کے سفر میں تو
کوئی منزل نہیں ہوتی
کہ تپتے ریگزاروں میں
ہمیشہ چلنا پڑتا ہے
یہ ایسا کھیل ہے جس میں
جہاں پہ جیت ہوتی ہے
وہیں پہ مات ہوتی ہے
فقط جو قرب پانے کو
محبت نام دیتے ہیں
بہت نادان ہوتے ہیں
سنو لڑکی
تمہیں تو بنتِ حوا کی
نظر آتی ہے مجبوری
تمہیں کیسے بتاؤں میں
کہ میں جو ابنِ آدم ہوں
مجھے بھی باندھ رکھا ہے
انہیں رسموں رواجوں نے
کہ جن کی قید میں تم ہو
انہیں کا میں بھی قیدی ہوں

❖❖❖

بیوپار

لاؤ مجھ کو دکھلاؤ تو
آنکھوں میں ہیں کیسے خواب
کچے ہیں یا پکے خواب
اچھا ان کے دام بتاؤ
دیکھو اتنا ذہن میں رکھنا
اس بازار میں خوابوں کے اب دام گرے ہیں
تجھ کو میں اِک بات بتاؤں
برسوں پہلے میں نے بھی یہ کام کیا تھا
خواب بنے تھے خواب بھی بیچے
مجھ کو تو یہ گورکھ دھندہ راس نہ آیا

نیند گنوائی چین گنوایا
دیکھو میرا کہنا مانو
ایسا کاروبار نہ کرنا
خوابوں کا بیوپار نہ کرنا
ایسے کاروبار میں اکثر
گھاٹا سہنا پڑتا ہے
کچے سپنے ٹوٹ گریں تو
آنکھیں چھلنی کرتے ہیں
نیند کا پنچھی کھو جاتا ہے
جینا مشکل ہو جاتا ہے





شاعری خیالات و احساسات کا آئینہ ہے
ارشد محمود ارشد کے کئی شاعری کے مجموعے
منظر عام پر آ چکے ہیں مضامینِ فطرت،
عہد حاضر کے مسائل، جدید غزل کی طرف
سفر اور دل فریب رچاؤ اس کی شاعری کے
خصوصی رنگ ہیں وہ اپنی ذات کی تکمیل
شاعری میں کرنا چاہتا ہے وہ دن دور نہیں
جب کامیابی اُس کے قدم چومے گی۔

کرنل سید مقبول حسین
(ستارہ ء امتیاز)
چیئرمین حرف اکادمی پاکستان

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہم کلام ہوا

بنانے والے نے سوچا یہ دل بناتے ہوئے
کہیں تو اپنے بھی رہنے کا انتظام ہوا

فلک سے یونہی تو ہم خاک پر نہیں آئے
ہمارے واسطے کیا کیا نہ اہتمام ہوا

نجانے کونسی جنت کی جستجو ہے تجھے
کہ جس کے واسطے جینا مرا حرام ہوا

بچا کے لایا تھا جنات سے میں شہزادی
اسی کے ساتھ کہانی کا اختتام ہوا

عجیب کیف میں ڈوبی تھیں انگلیاں ارشدؔ
کسی کا لمس مری عمر بھر کا جام ہوا

ا ح د ب
حرف اکادمی
ISBN NO: 978-969-8644-68-0